کارِ مسلسل
علیم الحق حقی

جب مَیں پہلی بار موت کی آغوش میں اُترا تو اپنی بیوی سے فون پر بات کر رہا تھا............!

آپ اس پر یقیناً حیران ہوں گے کہ پہلی بار موت کی آغوش میں اترنے کا کیا مطلب ہے۔ آپ شاید سوچیں گے کہ میں نے محاورتاً یہ بات کہی ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ میری سرگزشت بہت حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین ہے۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوا، اس کی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی لیکن دنیا میں ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جن کی توجیہہ ممکن نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ بات ہوئی ہی نہ ہو۔ مَیں کوئی فاترالعقل انسان ہوں یا کوئی سزا جھیل رہا ہوں، اس کا فیصلہ آپ میری سرگزشت پڑھ کر کیجیے گا۔

تو مَیں اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا فون پر اپنی بیوی سے بات کر رہا تھا
"آفاق......... تمہیں احساس بھی نہیں کہ..........." بلقیس نے کہا اور اپنی عادت کے مطابق بات نامکمل چھوڑ دی۔ اس کا یہ نامکمل جملہ جو وہ اپنی مرضی کے مطابق بعد میں مکمل کرتی تھی، میرے احساسِ جرم کو بڑھا دیتا تھا۔ اس کے خیال میں مجھے کسی بات کا احساس نہیں تھا۔ مَیں بہت غیر ذمے دار آدمی تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ میری آمدنی کم تھی۔ ضروریات پوری نہیں ہوتی تھیں اور اس کا مطلب ہوتا تھا کہ مجھے کسی بات کا احساس نہیں تھا۔

مگر مَیں نے بہت اچھا وقت دیکھا تھا۔ میرے والد صنعت کار تھے۔ تعلیم مَیں نے امریکہ میں حاصل کی۔ مجھے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ جرنلزم کی ڈگری لے کر میں وطن واپس آیا۔ چند ماہ مَیں نے ایک اخبار میں کام کیا لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میری

ڈگری کم از کم وطنِ عزیز میں بے کار ہے۔ یہاں خبر تلاش کرنے کا رواج نہیں۔ خبریں حکومت اور پارٹیوں کی طرف سے فراہم کی جاتی ہیں۔ دباؤ بے حد رہتا ہے۔ مَیں بددل ہو گیا۔ نوکری کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔ بس مجھے صحافت کا شوق تھا۔ ابو ویسے ہی ملازمت کے خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مَیں کاروبار سنبھالوں۔ چنانچہ مَیں نے اپنی آٹو انڈسٹری جانا شروع کر دیا۔ معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے۔

۱۹۷۰ء میں میری بلقیس سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ۱۹۷۱ء کے اوائل میں ہماری شادی ہو گئی۔ وہ ملک کے لئے بہت کڑا وقت تھا۔ دسمبر ۷۱ء میں سقوطِ مشرقی پاکستان کا سانحہ ہوا۔ اس کے بعد نئی حکومت نے اقتدار سنبھالا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے زوال کا آغاز ہو گیا۔ وہ ایسے کہ ہم قومیا لئے گئے۔ بدقسمتی سے یہ ایسے موقع پر ہوا جب ابو نے کاروبار کو وسعت دینے کے لئے سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ چنانچہ ہم قلاش ہو گئے۔

اس المئے کے بعد گھر میری ہی ذمے داری بن گیا۔ ہمارے پاس ایک کوٹھی تھی۔ اسے بیچ کر ابو نے میری بہن کوثر کی شادی کر دی۔ ہم ایک فلیٹ میں رہنے لگے۔ میں نے ایک اخبار میں جاب کر لی۔ پاکستان میں ایک صحافی کے لئے لکھنے کو بہت کچھ ہوتا ہے مگر عافیت نہ لکھنے ہی میں ہوتی ہے۔ یہ بات اس وقت میں نہیں سمجھ سکا۔ مَیں نے حکومت کی منافقانہ پالیسیوں کے متعلق بہت لکھا اور کھل کر لکھا۔ مَیں نے حکومت کی زرعی اصلاحات کی قلعی کھولی۔ ان اصلاحات کا مقصد جاگیرداری نظام کا خاتمہ کرنا تھا۔ مگر اسے صرف سیاسی مخالفین کے خلاف استعمال کیا گیا۔ مجھ جیسے غریب صحافی کی اوقعات ہی کیا تھی۔ پہلے تو مجھے سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ پھر فِکس کئے جانے کی دھمکیاں ملنے لگیں۔ اس کے بعد میرے خلاف کارروائی شروع کر دی گئی۔ میرے خلاف کئی کیس بنے۔ میری مرمت بھی کرائی گئی مگر ہر کارروائی کے ساتھ میری ضد بڑھتی گئی۔ وہ بہت سخت دن تھے۔ ہمارے گھر کی حالت ابتر ہوتی گئی۔

پھر فوجی آمریت آئی۔ ضیاء الحق کافی .... مختلف آدمی تھے۔ ان میں نرمی، حلیمی، انکسار اور شائستگی کی خوبیاں تھیں۔ تاہم صحافت کے بارے میں ان کا رویہ بھی اپنے پیش رووں سے مختلف نہیں تھا۔ میری صعوبتیں تو کم ہو گئیں لیکن مالی حالات بہتر نہیں ہوئے۔ ۸۱ء میں یکے بعد دیگرے میرے ابو اور امی کا انتقال ہو گیا۔ مَیں بدستور

روزنامہ جمہور میں کام کرتا رہا۔ ہر دور میں مجھے حزبِ اختلاف کا حامی سمجھا گیا۔ اس لئے کہ کوئی حکومت بھی منافقوں سے پاک نہیں تھی۔

یہ ہے میرا مختصر تعارف۔ تفصیلات آپ کو میری کہانی میں جابجا ملتی رہیں گی۔

وہ ۱۸ اکتوبر ۹۳ء کا دن تھا، جس سے میں نے اپنی سرگزشت کا آغاز کیا ہے۔ میری بیوی بلقیس نے مجھے میرے دفتر فون کیا تھا۔ "آفاق، تمہیں احساس بھی نہیں کہ..........." اس نے کہا اور عادت کے مطابق جملہ نامکمل چھوڑ دیا لیکن اس نے جملہ پورا کر بھی دیا ہوتا تو مَیں نہ سن پاتا۔ اس لئے کہ مجھے اسی لمحے اپنے سینے کے اندر بائیں جانب کوئی سخت اور بھاری چیز پوری قوت سے ٹکراتی محسوس ہوئی۔ میری سانس اکھڑ گئی۔ ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹا اور میز پر رکھے شیشے کے پیپر ویٹ سے ٹکرایا۔ پیپر ویٹ نیچے گرا اور ٹوٹ گیا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ وہ میرے آخری لمحے ہیں اور میں مر رہا ہوں۔

ان آخری لمحوں میں مجھے یاد آیا کہ بلقیس نے ایک ہفتے پہلے ہی یہی بات کہی تھی اور کہہ کر توقف بھی کیا تھا لیکن وہ اس وقفے کی طرح ابدی وقفہ نہیں تھا۔ اس وقت مَیں اپنے گھر کے کچن میں بیٹھا چائے پی رہا تھا اور بلقیس سامنے بیٹھی پیاز کاٹ رہی تھی اور شاید اس کے آنسوؤں نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مجھے ہمیشہ کی طرح پوچھنا چاہئے تھا........... کیا ہو گیا ڈیئر؟ اس وقت میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کا جملہ سن کر میں نے سر اٹھایا اور اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں دیکھا۔ میری توجہ اخبار کی طرف نہیں رہی بلکہ عرصے سے مَیں نے بلقیس کو اتنی توجہ نہیں دی تھی۔ میں خاموشی سے اس کی آنکھوں میں وہ آنسو دیکھتا رہا جو درحقیقت پیاز کاٹنے کی وجہ سے آئے تھے مگر مجھے اس وقت وہ سچے آنسو لگ رہے تھے۔ مَیں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ مجھے کس کس بات کا احساس نہیں ہے۔

زندگی میں اتنی چیزوں کی کمی تھی........... کہہ رہی تھی کہ فہرست بنانے بیٹھتا تو طویل فہرست بنتی۔ زندگی معمولات میں گھری ہوئی تھی جس کے نتیجے میں ہم اکتاہٹ اور بیزاری کا شکار ہو گئے تھے۔ کبھی تو ایسا ہوتا کہ چند روز کی چھٹیاں لے کر کم از کم مری ہی چلے جاتے۔ یا ہمارا اچھا سا مکان ہوتا کسی اچھے علاقے میں۔ ٹی وی کے علاوہ بھی کوئی تفریح ہوتی۔ سوشل لائف ہوتی اور کچھ نہ ہوتا تو بچے ہی ہوتے۔ مجھے تو اپنے کام کا سہارا

تھا لیکن بلقیس تو بالکل اکیلی تھی۔ یہ اولاد کی محرومی سب سے بڑی محرومی تھی لیکن ۷۵ء میں ایسا امکان پیدا ہوا تھا اور ہم بہت خوش تھے۔ اس کے بعد وہ حمل ضائع ہو گیا۔ بلقیس نے اس کا ذمے دار ہمیشہ مجھے ٹھہرایا۔ اس کے خیال میں اس عرصے میں مجھے گھر کے کام کے لئے ملازمہ رکھ لینا چاہئے تھی جبکہ میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بھاری بالٹی اٹھائے ہوئے تھی کہ باتھ روم میں اس کا پاؤں پھسل گیا تھا۔ بہرحال اس کے بعد اولاد کا امکان ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا تھا۔

اس صبح میں نے سوچا تھا .... مجھے احساس ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے کھل کر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ اس محبت پر بات کرنے کی ضرورت، جس کا اظہار ہم وقتاً فوقتاً کرتے رہتے تھے مگر جو مر چکی تھی اور اس کا الزام نہ مجھ پر آ سکتا تھا نہ بلقیس پر۔ بس ہونے والی بات تھی جو ہو چکی تھی۔

مَیں چونکا، میں نے سوچا۔ مَیں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہا ہوں جبکہ مَیں مر رہا ہوں۔ بے سود زندگی ختم ہو رہی ہے۔ میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ خدا نے مسلسل میرے ساتھ بے انصافی کی ہے۔ مجھے کبھی کوئی موقع نہیں ملا ورنہ مَیں زندگی کو بدل کر رکھ دیتا اور آج خوش اور مطمئن ہوتا۔ میرے کام بننے کے بجائے بگڑتے چلے گئے۔ مَیں ہمیشہ یہی کہتا .... یہی سوچتا رہا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو........ کاش یوں ہو جاتا۔ مگر وقت نے ایک بار بھی میری یہ حسرت پوری نہیں ہونے دی۔ خدا نے کبھی مجھے کوئی موقع نہیں دیا، بڑی زیادتی ہوئی میرے ساتھ۔

مَیں پھر چونکا۔ مرتے وقت یہ سب کچھ........؟ ایسے میں تو انسان توبہ کرتا ہے یا زندگی کے اہم واقعات کی فلم تیز موشن میں دیکھتا ہے اور مَیں؟ مَیں خدا سے شکووں میں مصروف ہوں۔

ریسیور ہاتھ سے چھوٹے چند سیکنڈ ہوئے تھے۔ مجھے آہستہ آہستہ ڈوبنے کا احساس ہو رہا تھا۔ سینے پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا، سانس لینا دشوار تر ہوا جا رہا تھا۔ پیشانی پسینے میں تر ہو چکی تھی اور پسینہ آنکھوں میں چبھ رہا تھا۔

مَیں ڈوب رہا ہوں .... میں مر رہا ہوں!

میرا چہرہ میز پر جا ٹکا۔ میرا داہنا رخسار اخباری تراشوں کی فائل پر ٹکا ہوا تھا۔ نیچے ٹوٹا ہوا پیپر ویٹ اپنی اکلوتی آنکھ سے مجھے گھور رہا تھا۔ جیسے دنیا ہی ٹوٹ پھوٹ گئی ہو۔ میرے سینے میں میرے دل کو جیسے درد کا کند دھار کا خنجر چیر رہا تھا۔ میری نظر میز پر رکھے ہوئے چھوٹے ڈیجیٹل کلاک پر پڑی۔

۱۸ اکتوبر ۹۳ء ایک بج کر چھ منٹ دوپہر۔

اس کے بعد سوچنے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ خیالات کی ڈور ٹوٹ گئی تھی۔

☆==========☆==========☆

مجھ سے سانس نہیں لی جا رہی تھی۔

مَیں نے سوچا، سانس کیسے لے سکتا ہوں، مَیں تو مر چکا ہوں۔ قدرتی بات ہے لیکن اگر مَیں مر چکا ہوں تو مجھے یہ احساس کیسے ہے کہ مجھ سے سانس نہیں لی جا رہی ہے۔ بلکہ مجھے تو سرے سے کچھ نہ محسوس ہونا چاہئے نہ معلوم۔

مَیں نے اپنا سر کمبل کے اندر ہی گھمایا اور گہری سانس لی۔ پھیپھڑوں میں جانے والی ہوا میں میرے پسینے کی بو شامل تھی۔

یعنی میں نہیں مرا تھا........ نہ جانے کیسے مگر یہ حقیقت تھی کہ میں زندہ تھا۔ اس احساس سے میرے جسم میں کوئی سنسنی نہیں دوڑی۔ جیسے مرتے وقت مجھے خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ ممکن ہے، اس لئے کہ غیر شعوری طور پر موت مجھے نجات کی صورت لگی ہو اور اب .... اب زندگی پہلے کی طرح جاری و ساری ہو جائے گی۔ طمانیت، خوشی، امید اور عزم سے محروم بے رنگ زندگی، جس میں ناکامیاں ہی ناکامیاں تھیں۔ ناکام ازدواجی زندگی، ناکام کیریئر........ سبھی کچھ ناکام۔

مَیں نے کمبل چہرے پر سے ہٹا دیا۔

اندھیرا کمرہ موسیقی کی بے حد دھیمی آواز سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک پرانا امریکی گیت تھا........ ڈاؤ رون رون........

مَیں نے لیمپ کے سوئچ کو ٹٹولا۔ دفتر میں جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد یا تو مَیں کسی اسپتال کے کمرے میں صحت یابی کے مرحلے میں داخل ہو رہا تھا یا پھر اپنے گھر میں موت کا خواب دیکھنے کے بعد بیدار ہو رہا تھا۔ میرا ہاتھ بیڈ لیمپ سے ٹکرایا۔ میں نے ٹٹول کر سوئچ

دبایا۔ روشنی ہو گئی۔

وہ چھوٹا سا بے ترتیب کمرہ تھا۔ دو کونوں میں دو میزیں اور کرسیاں تھیں۔ میزوں، کرسیوں اور فرش پر کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ جابجا کپڑے بھی بکھرے ہوئے تھے۔ وہ نہ تو کسی اسپتال کا کمرہ تھا اور نہ ہی میرے گھر کا جانا پہچانا کمرہ۔

ایک دیوار پر ٹیپ کی مدد سے ایک مسکراتی ہوئی برہنہ عورت کی تصویر چپکائی گئی تھی۔ وہ میگزین پلے بوائے کا درمیانی رنگین ورق تھا۔ عورت کو دیکھ کر پرانے وقتوں کی جوان جیکولین کینیڈی کا خیال آتا تھا۔ مَیں نے سر گھما کر دیکھا۔ دیگر دیواروں کا بھی یہی حال تھا۔ ایک پر بُل فائٹنگ کا اِن ایکشن پوسٹر لگا تھا۔ ایک پر سرخ جیگوار کار کی تصویر لگی تھی۔ ایک میز کے اوپر سرخ، سفید اور نیلے رنگ کا ستاروں اور پٹیوں والا بینر تھا جس پر لکھا تھا .... کمیونزم کی ایسی تیسی۔ مجھے یاد آیا کہ امریکہ میں میرے روم میٹ نے ہمارے مشترکہ کمرے میں ایسا ہی بینر لگایا ہوا تھا۔ مَیں بے ساختہ مسکرا دیا۔

پھر اچانک اٹھ بیٹھا۔ میرا دل جیسے میرے کانوں میں دھڑک رہا تھا۔

وہ کمرہ جانا پہچانا تھا۔ ڈیسک پر رکھا ہوا سبز رنگ کا لیمپ، میرے روم میٹ مارٹن کے بیڈ کے پاس فرش پر سرخ دھبا .... سب کچھ وہی تھا۔ میری آنکھ کھلی تو ذہن الجھ گیا تھا لیکن اب تو دماغ میں جیسے سناٹے اتر آئے تھے۔ میرے حواس جواب دینے لگے۔ میں ہڑبڑا کر بیڈ سے اترا اور لرزتے قدموں سے ایک ڈیسک کی طرف بڑھا۔ وہ میری اپنی ڈیسک تھی۔ مَیں نے اس پر رکھی کتابوں کو ٹٹولا۔ وہ میری کتابیں تھیں۔ مَیں نے ایک کتاب کی ورق گردانی کی۔ صفحات کے صفحات خط کشیدہ تھے، حاشئے میں نوٹس بھی لکھے تھے .... تحریر میری اپنی تھی۔

مَیں نے بڑھ کر ریڈیو آف کیا اور اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ یا الٰہی .... یہ سب کیا ہے؟ کسی نے میرے ساتھ مذاق تو نہیں کیا؟ لیکن نہیں .... اتنا اہتمام کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرا ہوسٹل کا کمرہ .... وہ امریکہ سے پاکستان تو نہیں آ سکتا تھا۔ یہ کتابیں .... ان پر میرے لکھے ہوئے نوٹس۔

ڈیسک پر نیوز ویک میگزین کی ایک کاپی رکھی تھی۔ کور اسٹوری مغربی جرمنی کے چانسلر کونراڈ اڈینار کے استعفے سے متعلق تھی۔ اس پر ۶ مئی ۶۳ء کی تاریخ تھی۔ میں

حیرت سے چھپے ہوئے ان ہندسوں کو دیکھتا رہا۔ شاید کوئی ہوشمندانہ توضیح ذہن میں آئے۔

لیکن میرا ذہن خالی تھا .... خالی رہا۔

اچانک دروازہ کھلا۔ دروازے کا لٹو بک کیس سے ٹکرایا۔ مجھے یاد تھا، دروازہ پورا کھولا جاتا تو یہ ہمیشہ ہوتا تھا۔

"اے .... تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ پونے گیارہ بجے ہیں۔ میرے خیال میں دس بجے تمہارا لٹریچر کا ٹیسٹ تھا۔"

میں نے دیکھا۔ کھلے دروازے میں مارٹن کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کوک تھی اور دوسرے میں کتابوں کا ڈھیر۔ مارٹن بیلے .... میرا فریش مین ایئر کا روم میٹ۔ میرا کالج کا سب سے قریبی دوست، جس سے برسوں میرا رابطہ رہا تھا۔ اس نے ۸۱ء میں طلاق کے بعد قلاش ہو جانے کے نتیجے میں خودکشی کر لی تھی۔

"اب تم کیا کرو گے؟" مارٹن نے پوچھا۔ "ایف گریڈ لو گے؟"

میں منہ پھاڑے اسے دیکھتا رہا۔ وہ نوجوان لگ رہا تھا۔ نوجوان تھا.........

"ہے .... کیا بات ہے آفاق؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ پریشان ہو گیا۔

"مَیں .... مَیں .... مَیں کچھ عجیب سا محسوس کر رہا ہوں........." میں نے بمشکل کہا۔

مارٹن نے قہقہہ لگایا اور کتابیں بیڈ پر اچھال دیں۔ "وہ تو مَیں جانتا ہوں۔ رات مینو کل بار میں ہی تمہارا برا حال ہو گیا تھا، اور اسکاچ میں بوربن ملا کر پیو۔ جوڈی موجود ہوتی تو تمہیں جان سے ہی مار دیتی۔"

میری پریشانی کی کوئی حد نہیں تھی۔ میرے ذہن میں ہزاروں باتیں تھیں، جو میں مارٹن سے کہنا چاہتا تھا لیکن اس پاگل کر دینے والی صورت حال میں میری کوئی بات ہوشمندانہ نہیں کہلا سکتی تھی۔ "کیا بات ہے آفاق! تمہارا حال تو بہت برا معلوم ہوتا ہے۔" مارٹن بولا۔

"مَیں .... مَیں باہر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔"

"یہ تو مَیں بھی دیکھ رہا ہوں۔" مارٹن کے لہجے میں الجھن تھی۔

مَیں نے اپنی کرسی پر پڑا چابیوں کا گچھا اٹھایا اور اپنے بیڈ کے ساتھ والی دیواری

الماری کی طرف بڑھ گیا۔ مَیں نے الماری میں سے شرٹ، کارڈ رائے کی جیکٹ اور پتلون نکالی اور باتھ روم میں چلا گیا۔ منہ پر دو چار چھپکے مارنے کے بعد مَیں نے کپڑے بدلے اور باہر آ گیا۔

"جاتے ہوئے انفرمری ہوتے جانا۔ کہنا کہ تمہیں فلو ہو گیا ہے۔ ممکن ہے، گیرٹ تمہیں بعد میں ٹیسٹ دینے کی اجازت دے دے۔" مارٹن نے مجھے ہدایت دی۔

"یہ تو مَیں کروں گا۔" میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

"اور آج رات "دی برڈ" کو نہ بھول جانا۔ پاؤلا اور جوڈی سات بجے ہمیں ڈولیز میں ملیں گی۔ پہلے کچھ کھائیں پئیں گے۔"

"ٹھیک ہے پھر ملیں گے۔" میں نے کہا اور دروازہ کھول کر کمرے سے نکل آیا۔

مَیں زینوں پر پہنچا اور دو دو کر کے سیڑھیاں پھلانگتا نیچے اترا۔ لابی بالکل ویسی ہی تھی جیسی مجھے یاد تھی۔ داہنی جانب ٹی وی روم تھا جو اس وقت خالی تھا لیکن سپورٹس اور خلائی پروگراموں کے موقع پر وہاں تل دھرنے کی جگہ بھی نہیں ہوتی تھی۔ سیڑھیوں کے نیچے چھ سات لڑکیاں اپنے اپنے بوائے فرینڈز کی منتظر تھیں۔ انہیں زینے پر قدم رکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ سٹوڈنٹس بلیٹن بورڈ کے پاس کوکا کولا کی مشینیں نصب تھیں۔

باہر ڈاگ وڈ کے درختوں پر پوری طرح بہار آئی ہوئی تھی۔ یونانی رومن ملے جلے طرز کی صاف ستھری عمارتیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ایموری ہے۔ میں لائبریری اور لاء بلڈنگ کے پاس سے گزرا۔ مَیں نے سوچا، یہ کوئی بھی سال ہو سکتا ہے .... ۶۳ء بھی اور آٹھویں دہائی کا کوئی سال بھی۔ ابھی تک مجھے اس سلسلے میں کوئی حتمی اشارہ نہیں ملا تھا۔

مَیں نے اس کیمپس میں برسوں گزارے تھے۔ یہاں مَیں نے وہ خواب دیکھے تھے جن کی تعبیر مجھے کبھی نہیں مل سکی تھی۔ یہاں وہ چھوٹا سا پُل بھی نظر آ رہا تھا جو چرچ سکول کی طرف لے جاتا تھا۔ مَیں جوڈی گورڈن کے ساتھ بارہا یہاں آیا تھا۔

کوئی ایک میل تک بھاگنے کے بعد مَیں کیمپس کے داخلی دروازے پر پہنچا۔ اب تک میرا سانس پھول جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ گلین میموریل چرچ کے سامنے والے ٹیلے پر کھڑے ہو کر میں نے نارتھ ڈیکاٹر روڈ اور ایموری ویلج کی طرف دیکھا۔

ملبوسات کی دکانوں اور بک سٹورز کی قطار جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ ایک خاص دکان .... ہورٹنز ڈرگ نے میرے اندر یادیں جگا دیں۔ مَیں نے تصور میں رسالوں کے ریک دیکھے اور لمبا سفید سوڈا فاؤنٹین اور سرخ لیدر بوتھ۔ ایک بوتھ میں، میں نے تصور میں جوڈی گورڈن کا تر و تازہ چہرہ دیکھا۔

مَیں نے سر جھٹکا اور توجہ سامنے کے منظر پر مرکوز کر دی۔ مجھے یہ اندازہ لگانا تھا کہ یہ کون سا سال ہے لیکن اس کے لئے میرے پاس فی الحال کوئی کلیو نہیں تھا۔ مَیں نے کاروں کو غور سے دیکھا۔ مجھے کہیں کوئی نسان یا ٹیوٹا نظر نہیں آئی۔ سڑک پر پرانی بڑی کاریں تھیں لیکن اس سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ بلکہ اب تو مَیں یہ سوچ رہا تھا کہ ہوسٹل کے کمرے میں مارٹن سے میرا ٹکراؤ کوئی وہم تو نہیں تھا۔ مگر پھر امریکہ میں میری موجودگی تو وہم نہیں ہو سکتی تھی۔ مَیں پاکستان سے امریکہ کیسے آ گیا؟ کیا مَیں خواب دیکھ رہا ہوں لیکن نہیں مَیں بیدار تھا اور امریکہ کی ریاست اٹلانٹا میں تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں غیر شعوری طور پر ناکام زندگی سے تنگ آ گیا تھا سو مَیں تصور میں جی رہا تھا۔

مَیں ٹیلے سے اترا اور کیب سٹینڈ کی طرف بڑھا۔ وہاں تین نیلی سفید ٹیکسیاں موجود تھیں۔ مَیں ایک ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ اس کا ڈرائیور جوان تھا اور انداز سے کوئی طالب علم لگ رہا تھا۔ "کہاں جانا ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"پیچ ٹری پلازہ ہوٹل۔" مَیں نے کہا۔ مَیں بعد میں بھی ایک بار یہاں آیا تھا۔ ۸۶ء میں۔ اس وقت یہ ہوٹل تعمیر ہو چکا تھا۔ مگر میرے زمانہ طالب علمی میں اس کا وجود بھی نہیں تھا۔

"دوبارہ بتانا۔" ڈرائیور بولا۔

"پیچ ٹری پلازہ ہوٹل۔" مَیں نے بتایا۔ "ڈاؤن ٹاؤن۔"

"مَیں نے تو کبھی یہ نام سنا بھی نہیں۔ پتہ ہے تمہارے پاس؟"

"ریجنسی تو معلوم ہے نا تمہیں۔ حیات ہاؤس جانتے ہو؟"

"ہاں ہاں۔ وہاں جانا ہے تمہیں؟"

"اس کے قریب۔"

"ٹھیک ہے، بیٹھ جاؤ۔"

ٹیکسی چند بلاک تک جنوب کی سمت گئی۔ پونس ڈی لیون ایونیو سے ہم داہنی جانب مڑے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس اجنبی پتلون میں پیسے بھی ہوں۔ یہ سوچ کر مَیں نے ہپ پاکٹ کو ٹٹولا۔ اس میں ایک بٹوہ موجود تھا جو میرا نہیں تھا۔

بہرحال بٹوے میں رقم موجود تھی۔ دو بیس ڈالر کے، ایک پانچ ڈالر کا اور چند ایک ڈالر کے نوٹ۔ یعنی ٹیکسی کے کرائے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مَیں نے سوچا، یہ رقم مَیں بطور قرض لے رہا ہوں اور بٹوے کے مالک کو لوٹا دوں گا۔ مگر کیسے؟ اور کہاں؟

مَیں نے بٹوے کے چھوٹے خانوں کو ٹٹولا۔ ایموری یونیورسٹی کا ایک سٹوڈنٹس آئیڈنٹٹی کارڈ برآمد ہوا۔ آفاق عباسی کے نام کا۔ ڈیکاٹر کے ایک ڈرائی کلینرز کی کپڑوں کی رسید بھی تھی۔ پھر ابو امی اور کوثر کی تصویر نکلی، جو ہمارے کراچی والے بنگلے کے لان میں کھینچی گئی تھی۔ وہ بنگلا جسے بیچ کر ہم نے کوثر کی شادی کی تھی۔

میرا دماغ پھر سائیں سائیں کرنے لگا۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

اچانک بٹوے کے ایک فلیپ سے میرے نام کا فلوریڈا کا ڈرائیونگ لائسنس نکل آیا۔ اس کی تنسیخ کی تاریخ ۲۷ فروری ۶۵ء تھی۔

☆=========☆=========☆

۷۹ء میں، میں نے مے نوشی ترک کر دی تھی۔ یا یوں کہئے کہ حالات نے مجبور کر دیا تھا اور مے دسترس میں بھی نہیں تھی۔ یہ بات مَیں نے حیات ریجنسی کے اس بار میں بیٹھ کر سوچی۔

ٹیکسی ڈرائیور کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ۷۰ منزلہ پیچ ٹری پلازہ ہوٹل ابھی تعمیر ہی نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ ادمنی انٹرنیشنل کے ٹاورز بھی نہیں تھے اور جارجیا پیسفک بلڈنگ کا بھی وجود نہیں تھا۔ یہ پرانا اٹلانٹا تھا۔

پھر مجھ پر سخت ترین لمحہ آیا۔ وہ یوں کہ میری نظر بار کے عقب میں آئینے پر پڑ گئی۔ مجھے احساس تھا کہ آئینے میں کیا نظر آئے گا۔ اس کے باوجود مجھے شاک لگا۔ ۱۸ سالہ دبلے پتلے آفاق عباسی کا چہرہ دیکھ کر شاک ہی لگ سکتا تھا۔ یہ وہ عرصہ تھا جب رنگت کے اعتبار سے میرا شمار کالوں میں کیا ہی نہیں جا سکتا تھا اور مَیں اپنی عمر سے بڑا بھی لگتا تھا۔ اس لئے

مجھے شراب طلب کرنے میں کبھی کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

مَیں اپنی اُس وقت کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔ اپنا تیس سال پرانا روپ دیکھنا عجیب اور انوکھا تجربہ تھا اور وہ تر و تازہ نوجوان چہرہ یادوں میں نہیں، حقیقت میں موجود تھا۔ میرے ہاتھ نرم تھے۔ ان پر لکیریں نہیں پڑی تھیں۔ ان ہاتھوں میں جام تھا اور آنکھوں میں جوانی کی چمک۔

"ایک اور جام لاؤں ہنی!" ویٹریس نے مجھے چونکا دیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ ایسا منی ڈریس پہنے ہوئے تھی جسے دو تین برس میں عام ہو جانا تھا۔ اب سے دو تین برس بعد..........!

خدا کی پناہ!

اب مَیں حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا لیکن مَیں عقلی طور پر خود کو قائل بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ ممکن ہے۔ مَیں تو ہارٹ اٹیک سے مرنے والا تھا لیکن بچ گیا تھا۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن وہ دل کا دورہ ۹۳ء کی بات تھی جبکہ اب میں اٹلانٹا میں تھا اور ۶۳ء میں سانس لے رہا تھا۔

میرا ذہن تیزی سے کوئی توجیہہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مَیں نے سائنسی ناول کثرت سے پڑھے تھے لیکن وقت میں سفر کرنے کی کوئی کہانی میری موجودہ صورتِ حال سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

مَیں نے نہ ایسے کسی سائنس دان سے رابطہ کیا تھا اور نہ ہی مجھے ٹائم مشین میسر تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ میرا جسم اگرچہ اٹھارہ سال کی عمر کا تھا لیکن ذہن اب بھی ۴۸ سالہ تھا۔ میرے پاس معلومات ۹۳ء تک کی تھیں۔ مگر میں ۶۳ء میں جی رہا تھا۔

مَیں موت سے بچ نکلا تھا لیکن شاید وقت کے ایک دھارے میں ۹۳ء میں میری تدفین کے انتظامات کئے جا رہے ہوں گے۔ ممکن ہے، مَیں کوما میں ہوں۔

"ہنی!" ویٹریس نے مجھے پھر چونکایا۔ "تمہارا جام بھر دوں؟"

"نہیں۔ میرا خیال ہے، مجھے کافی پلا دو۔" مَیں نے کہا۔

"ضرور۔ آئرش کافی لے آؤں؟" ویٹریس کے انداز میں لگاوٹ تھی۔

"نہیں۔ کریم کے ساتھ لے آؤ۔"

ماضی کی وہ لڑکی کافی لے آئی۔ مَیں کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے اس ماضی اور حال کے بارے میں سوچتا رہا جو وقت کی نامعلوم بازی گری کی وجہ سے مستقبل ہو گیا تھا۔ کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی دنیا خواب نہیں تھی۔ وہ حقیقی تھی اور وہ ۶۳ء کا موسم بہار تھا۔

مجھے زندگی کی دوبارہ تعمیر کا موقع دیا گیا تھا اور مجھے اس موقع سے پوری طرح استفادہ کرنا تھا۔ میرے سامنے راستے ہی راستے تھے۔

☆==========☆==========☆

مَیں دیر تک اٹلانٹا کے ڈاؤن ٹاؤن کی سڑکوں پر سرگشت کرتا رہا۔ مجھے تقدیر سے بڑی شکایتیں رہی تھیں۔ زندگی سے بڑے گلے تھے مجھے۔ مَیں ہمیشہ ناشکرے پن کا مرتکب ہوتا رہا تھا۔ شاید قدرت نے رحم کھا کر.......... یا شاید برہمی سے مجھے اپنی تقدیر بدلنے کا ایک موقع دیا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ مجھے اختیار بھی دیا گیا ہے یا مَیں مجبور محض ہوں اور اختیار دیا گیا ہے تو کس حد تک؟ یہ بہرحال کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ جلد ہی معلوم ہو جاتا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ اب مَیں اس جھٹکے سے سنبھل رہا تھا۔ یہ حقیقت مجھے ہضم ہونے لگی تھی۔

یونہی پھرتے پھرتے رات کے گیارہ بج گئے۔ مجھے بھوک لگنے لگی۔ فائیو پوائنٹس کے قریب ایک ریسٹورنٹ میں، مَیں نے کھانا کھایا۔ اس ریسٹورنٹ میں جوڈی اور مَیں اکثر فلم دیکھنے کے بعد کھانا کھانے آتے رہے تھے لیکن میں یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ میرا ذہن الجھ رہا تھا۔ ہر دکان، ہر جگہ مجھے جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی۔ ہر چہرہ شناسا لگتا تھا۔ ابھی مَیں خود اپنے اعتبار کے قابل نہیں تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ تیس سال پہلے کی ہر بات مجھے یاد نہیں ہے۔ نہ ہر ملنے والے کا نام مجھے یاد ہو سکتا ہے۔ آدمی اپنا ہر لمحہ تو یاد نہیں رکھ سکتا۔ ویسے میری یادداشت بہت اچھی ہے لیکن پھر بھی سب کچھ تو یاد نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ چیز میرے لئے مسائل کھڑے کر سکتی تھی۔

کھانا کھا کر مَیں نے سوچا کہ سب سے زیادہ مجھے ایک نیند کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے، صبح سو کر اٹھوں تو یہ بابِ طلسم ہوشربا بند ہو چکا ہو۔ مَیں اُس دنیا میں جاگوں جہاں مجھ پر ہارٹ اٹیک ہوا تھا لیکن مَیں جانتا تھا کہ اس کا امکان کم

ہے۔

سونے کے لئے مجھے دوبارہ ایموری جانا تھا۔ اپنے ہوسٹل کے کمرے میں۔ اگرچہ میں مارٹن کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن میرے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ کسی ہوٹل میں کمرہ لے کر رات گزارتا۔ پھر مَیں نے سوچا، ممکن ہے مارٹن سو ہی چکا ہو۔

لیکن ایسا نہیں تھا۔ میرا روم میٹ جاگ رہا تھا۔ وہ ڈیسک پر بیٹھا کسی میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس نے سرد نظروں سے مجھے دیکھا اور میگزین ایک طرف رکھ دیا

”کیوں بھئی .... تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟“ اس نے پوچھا۔

”یونہی پھرتا رہا سڑکوں پر۔“

”یونہی پھرتے ہوئے ڈولیز تک نہیں آ سکتے تھے۔“ اس نے مجھ پر آنکھیں نکالیں ”چلو ڈولیز نہ سہی، فاک تھیٹر ہی آ جاتے۔ ہم نے تمہارے انتظار میں فلم کا ابتدائی حصہ بھی گنوا دیا۔“

”سوری مارٹن! میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”اتنا تو کر سکتے تھے کہ میرے نام رقعہ چھوڑ جاتے۔ یا جوڈی کو فون کر دیتے۔ وہ تمہارے لئے فکرمند ہوتی رہی کہ جانے کیا ہوا ہے۔“

”دیکھو۔ میرا بہت برا حال ہے۔ اس وقت بات کرنے کے قابل بھی نہیں ہوں مَیں۔ اوکے؟“

مارٹن ہنسنے لگا۔ ”کل تک بات کرنے کے قابل ضرور ہو جانا۔ ورنہ شاید جوڈی تم سے آئندہ کبھی نہیں ملے۔ اسے پتہ چلے گا کہ زندہ ہونے کے باوجود تم وعدے کے مطابق نہیں آئے تو وہ بہت خفا ہو گی۔“

☆==========☆==========☆

مَیں نے خواب میں خود کو مرتے دیکھا۔ آنکھ کھلی تو مَیں بدستور ہوسٹل کے کمرے میں تھا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ مارٹن کمرے میں موجود نہیں تھا۔ شاید اس کی کلاس .... لیکن نہیں۔ مجھے یاد آ گیا کہ وہ ہفتے کی صبح ہے۔ تو کیا ہفتے کے دن کلاسیں ہوتی ہیں؟ مَیں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

کچھ بھی رہا ہو .... مَیں کمرے میں اکیلا تھا۔ اس تنہائی سے مجھے فائدہ اٹھانا

تھا۔ مَیں نے کمرے کی تلاشی لی۔ گتے کے ایک ڈبے میں مجھے تصویریں اور خطوط ملے۔ خطوط ابو اور کوثر کے لکھے ہوئے تھے اور تصویریں بھی ابو، امی، کوثر کی اور میری تھیں۔ بعض تصویریں میرے بچپن کی بھی تھیں۔

مجھے یاد آیا کہ ۶۳ء کے موسمِ بہار میں میرے ابو، امی اور کوثر بھی اورلینڈو میں مقیم تھے۔ وہاں فون بھی تھا مگر نمبر مجھے یاد نہیں تھا البتہ اس مکان کا پتہ یاد تھا جو ابو نے کرائے پر لیا تھا۔ اس کی مدد سے فون نمبر مل سکتا تھا۔ مَیں نے جیب میں سکے ڈالے اور ہال میں لگے پے فون کی طرف چل دیا۔

رابطہ ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ دوسری طرف ریسیور امی نے اٹھایا

"امی؟" مَیں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ نہ جانے کیوں مجھے ڈر لگ رہا تھا۔

"آفاق!" امی نے فوراً ہی میری آواز پہچان لی۔ "سنتے ہیں .... آفاق کا فون ہے" انہوں نے ابو سے کہا پھر بولیں۔ "کیا بات ہے آفاق! خیریت تو ہے؟"

"جی امی، خیریت ہے۔ آپ تو ٹھیک ہیں نا؟"

"ٹھیک ہوں۔ مگر یہ سوچ کر اداس ہو جاتی ہوں کہ اب وطن واپس جانا ہے پھر اتنی دوری.........."

"اسی لئے تو مَیں نے ہوسٹل میں رہنے کو آپ کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے پر ترجیح دی۔" میں نے کہا۔ مجھے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ "آپ لوگوں کے ساتھ زیادہ دن رہتا تو پھر آپ کے جانے کے بعد ہوسٹل کی تنہائی بہت خوفناک معلوم ہوتی۔"

"مَیں بھی سمجھتی ہوں یہ بات۔" امی نے کہا۔ "لو.......... اپنے ابو سے بات کرو۔"

اگلے ہی لمحے ریسیور پر ابو کی آواز اُبھری "کیسے ہو بیٹے؟ ابھی ہم تمہارے ہی متعلق باتیں کر رہے تھے۔ آج ہفتہ ہے۔ تمہیں تو ہمارے پاس ہونا چاہئے تھا۔"

"سوری ابو! وہ انگلش لٹریچر کے ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"یہ ٹیسٹ تو کل ہو چکا ہو گا۔"

مَیں گڑبڑا گیا۔ ابتدا ہی جھوٹ سے ہوئی تھی۔ مزید جھوٹ بولنا ضروری ہو گیا تھا

"وہ ملتوی ہو گیا ابو! اب پیر کو ہو گا۔"

"مجھے افسوس ہوا سن کر۔ کل ہماری واپسی ہے۔" ابو کے لہجے میں افسردگی تھی۔ "شام کو ہم تم سے ملنے خود آئیں گے، کل اور ہاں .... گاڑی تو ٹھیک چل رہی ہے نا؟"

برسوں میں مجھے اس شیورلیٹ کا خیال نہیں آیا تھا جس کی خریداری کے لئے ابو نے خاص طور پر مجھے پاکستان سے رقم بھجوائی تھی۔ "گاڑی ٹھیک ٹھاک ہے ابو!" میں نے کہا۔ وہ محض میرا اندازہ تھا کیونکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مَیں نے وہ گاڑی کہاں پارک کی ہو گی۔

"ٹھیک ہے آفاق! کل ہم تم سے ملنے آئیں گے۔ خدا حافظ بیٹے۔" ابو نے کہا۔

"خدا حافظ ابو!" مَیں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ میری پیشانی پسینے میں بھیگ گئی تھی۔ میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ مَیں سیڑھیاں اتر کر نیچے لابی میں گیا۔ میں نے ایک کوک لی اور تین گھونٹ میں حلق سے اتار لی۔ ٹی وی روم میں کوئی موجود تھا اور پروگرام اسکائی کنگ دیکھ رہا تھا۔

مَیں نے اپنی جیب ٹٹولی اور کی رِنگ نکال لیا۔ اس میں چھ چابیاں تھیں۔ ان میں ایک کمرے کی چابی تھی، جس کی مدد سے رات دروازہ کھول کر مَیں کمرے میں داخل ہوا تھا۔ تین چابیاں ایسی تھیں جو مَیں نہیں پہچان سکتا تھا۔ دو چابیاں یقینی طور پر شیورلیٹ کی تھیں .... اگنیشن اور ڈکی کی چابیاں۔

میں باہر نکل آیا۔ چمکدار دھوپ میں کیمپس پر وہ مخصوص خاموشی مسلط تھی، جو ویک اینڈ سے مشروط ہوتی ہے۔ مَیں نے اپنی ۵۸ء ماڈل کی نیلی سفید شیورلیٹ کی تلاش میں پارکنگ لاٹ کا جائزہ لیا لیکن گاڑی کہیں نظر نہیں آئی۔ مَیں پیٹرس ڈرائیو کی طرف چل دیا۔ وہاں سے چکر لگا کر مَیں ڈوبلی ہال کی طرف نکلا۔ وہ لڑکوں کے ہوسٹل کا عقبی حصہ تھا۔ میری کار وہاں بھی نہیں تھی۔

کانٹنن روڈ پر جاتے ہوئے ائرفورس آر او ٹی سی میدان کی طرف سے فوجیوں کے احکامات کی آوازیں سنائی دیں۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں پوسٹ آفس سے بائیں جانب مڑ گیا اور اس سڑک پر چل دیا جو فی چی میڈیکل فریٹرنٹی کے سامنے سے گزرتی تھی۔ وہاں کیمپس کی حدود ختم ہوتی تھیں۔

کوئی ایک بلاک دور مجھے اپنی کار نظر آ گئی۔ مجھے یاد آیا کہ مَیں فریش مین ہوں اور اگلے سال تک اپنی کار پارکنگ میں کھڑی رکھنے کا حقدار نہیں ہوں۔ پہلے سال کے دوران مجھے اپنی کار کیمپس سے دور پارک کرنا تھی۔

مَیں کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار میں مخصوص مہک پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے بہت کچھ یاد آنے لگا۔ اس سیٹ پر مَیں نے سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں گھنٹے گزارے تھے۔ جوڈی کے ساتھ ڈرائیو اِن سینما میں اور ریسٹورانوں میں جاتا رہا تھا۔ مارٹن اور دوسرے دوستوں کے ساتھ اور اکیلے ڈرائیو کرتا تھا۔ شکاگو، فلوریڈا .... اور ایک بار تو میکسیکو سٹی تک گیا تھا۔ مجھے اس کار سے محبت تھی مگر اس وقت مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ یہ اندازہ مجھے اب ہو رہا تھا۔

مَیں نے اگنیشن میں چابی لگائی اور کار کو سٹارٹ کیا۔ انجن نے ایک بار بیک فائر کیا اور پھر غرانے لگا۔ مَیں نے کار کو موڑا۔ کلفٹن روڈ سے داہنے ہاتھ پر موڑ کر کیمونی کیبل ڈزیز کنٹرول کی عمارت کے سامنے سے گزرا۔ اسے ۱۹۸۶ء میں بھی سی ڈی سی کہا جاتا تھا۔ البتہ نام سینٹر فار ڈزیز کنٹرول ہو گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب ایڈز کی بیماری انسانیت پر حملہ آور ہو چکی تھی۔

میرے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ مستقبل میں انسانیت کے لئے کیا کچھ تھا، مجھے معلوم تھا۔ ۶۳ء کے لوگوں کو تو اندازہ بھی نہیں تھا۔

برائر کلف روڈ سے مَیں بائیں جانب مڑا۔ یہ کیمپس کے مغرب میں رہائشی علاقہ تھا۔ آگے جا کر یہ سڑک مورلینڈ ایونیو ہو گئی۔ مَیں ڈرائیو کرتا رہا۔

ذرا دیر بعد میں نارتھ ڈرویڈ ہلز روڈ کے ایک بار میں بیٹھا تھا۔ یہاں اس بات کا امکان نہیں تھا کہ یونیورسٹی کے کسی لڑکے سے میرا سامنا ہو گا۔

بار کے اوپر بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی رکھا تھا۔ مَیں نے جیک ڈینیل کے جام سے ایک گھونٹ لیا اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مَیں اس وقت یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اب مجھے اپنی تعلیم دوبارہ مکمل کرنی ہو گی۔ وہ سب کچھ دوبارہ پڑھنا ہو گا جو مَیں تیس برس پہلے پڑھ چکا تھا۔ یہ تو اچھی خاصی سزا تھی۔ بوریت کا سامان تھا۔

سپورٹس اناؤنسر اے لیگ بیس بال سکورز کی فہرست دہرا رہا تھا۔ مَیں نے اپنے

لئے ایک اور جام طلب کیا اور توجہ .... ٹی وی پر مرکوز کر دی۔ بیس بال ہی کیا، سپورٹس سے مجھے ہمیشہ سے لگاؤ رہا تھا۔ اب اناؤنسر کینٹکی ڈربی ریس کے متعلق بتا رہا تھا۔

مَیں نے سوچا .... واہ۔ میرے پاس تو کافی معلومات ہیں، جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ میرے پاس ٹیکنیکل معلومات تو نہیں ہیں، مَیں کمپیوٹر نہیں بنا سکتا لیکن میرے پاس ایک صحافی کی تاریخ بہرحال موجود ہے۔ کب کیا ہوا۔ رجحانات کیسے بدلے، کون سا مقابلہ کون جیتا۔

اچانک میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ مَیں شرطوں کے ذریعے بہ آسانی دولت کما سکتا ہوں۔ سپوٹس کے موقعوں پر .... صدارتی انتخابات کے موقع پر۔ بشرطیکہ میرے پاس جو آئندہ تیس برسوں کی معلومات ہیں وہ یقینی اور قابلِ اعتبار ہوں۔ مگر اچانک ہی مجھے شک ہونے لگا کہ اپنی دانست میں جو اگلے تیس سال مَیں نے گزارے ہیں، ممکن ہے وہ میرا واہمہ ہوں۔ جو کچھ موجود ہے وہ تو بلاشبہ حقیقت ہے لیکن جو مستقبل میں گزارا تھا، ممکن ہے وہ خواب ہو یا کوئی واہمہ.........

اناؤنسر ریس میں دوڑنے والے گھوڑوں کے متعلق بتا رہا تھا۔ نیوربینڈ، نورابری.........

مَیں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ ۶۳ء کی ڈربی کس گھوڑے نے جیتی تھی۔ مَیں ذہن پر زور دیتا رہا۔ نیوربینڈ جانا پہچانا نام لگ رہا تھا لیکن جانے کیوں مجھے تسلی نہیں ہوئی۔ نورابری کا نام سن کر مجھے کچھ نہیں ہوا تھا۔

اناؤنسر کہہ رہا تھا ان دونوں گھوڑوں کو ولی شو میکر، ویسٹرن ونڈر اور کینڈی سپائس سے سخت مقابلہ کرنا ہو گا۔ بہرحال کینڈی سپائس ہاٹ فیورٹ ہے.........'

ان میں سے کوئی نام سن کر میرے ذہن میں گھنٹی نہیں بجی۔ مَیں ذہن پر زور دیتا رہا۔ کون سا گھوڑا جیتے گا۔ نارتھرن ڈانسر؟ کوائی گنگ؟ مجھے یقین تھا کہ ان دونوں گھوڑوں نے ڈربی جیتی ہے مگر کس سال؟ یہ مَیں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

"بارٹینڈر، سنو!" مَیں نے کہا۔

"ایک جام اور؟"

"نہیں، شکریہ۔ یہ بتاؤ، تمہارے پاس اخبار ہے؟" مَیں نے کہا۔ "آج کا ہو چاہے

کل کا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"دی جرنل ہے میرے پاس۔"

"مجھے سپورٹس کا صفحہ درکار ہے۔"

بارٹینڈر نے اخبار کا سپورٹس پیج میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بیس بال کا صفحہ الٹا اور گھڑ دوڑ کا صفحہ نکال کر گھوڑوں کے نام چیک کرنے لگا۔ ریس کے فیورٹ گھوڑے وہی تھے جن کے متعلق ٹی وی پر اناؤنسر نے بتایا تھا۔ کینڈی سپائس، نیوربینڈ، نورابری، پھر رائل ٹاور، لیمپ ٹوئسٹ .... نہیں .... نہیں .... گرے پیٹ! اس کا تو میں نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ وائلڈ کارڈ، راجا نور.......... نہیں نہیں .... بون جور .... اون مائی آنر .... نہیں۔

پھر میری نظریں ایک گھوڑے کے نام پر جم گئیں۔ چیپئوگے! چیپئوگے .... بھاؤ ایک پر گیارہ!

☆==========☆==========☆

میری شیورلیٹ چھ سو ڈالر میں بکی۔ ابو امی اور کوثر کے ساتھ مجھ سے الوداعی ملاقات کے لئے آئے تھے تو مجھے پانچ سو ڈالر دے گئے تھے۔ اپنی کتابیں، اپنا سٹیریو اور ریکارڈ فروخت کر کے مجھے دو سو ساٹھ ڈالر اور ملے۔ بینک اکاؤنٹ میں بیس ڈالر چھوڑ کر میں نے باقی رقم نکلوائی۔ یوں ۸۷۰ ڈالر اور آ گئے۔

اب مجھے شرط لگانا تھی .... بڑی شرط! مگر کیسے؟ میں نے سوچا، خود لوئس ول جاؤں اور شرط لگا دوں لیکن ٹریول ایجنٹ سے معلوم ہوا کہ ڈربی کے ٹکٹ ہفتوں پہلے سولڈ آؤٹ ہو چکے ہیں۔

اب کیا کیا جائے!

مسئلہ میری عمر کا بھی تھا۔ میں اپنی عمر سے بڑا لگتا تھا۔ اس کا فائدہ اٹھا کر میں کسی بھی بار میں ڈرنک طلب کر لیتا تھا لیکن شرط کی بات اور تھی اور وہ بھی اتنی بڑی شرط کی۔ اس معاملے میں کڑی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ مجھے آگے رکھنے کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت تھی جو عمر میں مجھ سے بڑا ہو۔

☆==========☆==========☆

"بکی؟ تم بکیوں کے بارے کیا جاننا چاہتے ہو لڑکے؟"

فرینک میڈوک کی عمر بائیس سال تھی۔ میرا جی چاہا کہ جواب میں اسے بھی لڑکا کہہ کر پکاروں لیکن میں ذہنی طور پر ۴۸ سال کا ہونے کے باوجود تھا ۱۸ سال کا ہی۔ وہ مجھ سے سینئر تھا۔ قانون پڑھ رہا تھا۔ اپنی دانست میں وہ تجربہ کار اور جہاں دیدہ مرد تھا.......... خاص طور پر میرے سامنے اور مجھے اس کی ضرورت تھی، اعتراض کیا کرتا۔ "مجھے ایک شرط لگانی ہے۔" میں نے کہا۔

میڈوک مسکرایا۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور بولا۔ "کیسی شرط .... کس پر؟"

"کینٹکی ڈربی پر۔"

"تو اپنے ہوسٹل میں پول کیوں نہیں شروع کر دیتے؟" اس نے ناصحانہ انداز میں کہا "زیادہ لڑکے شامل ہوں گے تو تگڑا مال بنے گا لیکن کام رازداری سے کرنا۔"

وہ مجھے بچوں کی طرح برت رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ وہ خواہ مخواہ ہی ہوشیار بن گیا تھا۔ میں نے لہجے میں انکسار سموتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا لمبی شرط لگانا چاہتا ہوں۔"

"بہت خوب؟ کتنی لمبی؟" اس کا انداز تمسخرانہ تھا۔

وہ جمعرات کی سہ پہر تھی۔ مینوئل بار تقریباً خالی تھا۔ یہ ڈر نہیں تھا کہ کوئی میری بات سن لے گا۔ "۲۳۰۰ ڈالر کی۔" میں نے کہا۔

فرینک میڈوک سوچ میں پڑ گیا۔ "یہ تو لمبی رقم ہے۔ مجھے معلوم ہے کینڈی سپائس کا جیتنا تقریباً یقینی ہے لیکن.........."

"نہیں۔ میں کینڈی سپائس پر شرط نہیں لگاؤں گا۔ ایک اور گھوڑا ہے میری نظر میں۔"

فرینک ہنسنے لگا۔ "خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو؟ لڑکے .... نورابری اور نیوربینڈ کم از کم اس ریس میں نہیں جیت سکتے۔ کوئی چانس نہیں ہے ان کا۔"

"دیکھو میڈوک، رقم میری ہے۔" میں نے پورے اعتماد سے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ اپنی جیت میں سے ۳۰ فیصد تمہیں دوں گا۔ اگر میرا اندازہ درست ہے تو تم بغیر کچھ خرچ کیے لمبی رقم کما لو گے۔"

فرینک مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ "دیکھو میں اس معاملے میں کسی مشکل میں بھی پھنس سکتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ لاء اسکول سے نکالا جاؤں اور تم ابھی بچے ہو۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہار گئے تو روتے ہوئے ڈین کے پاس نہیں بھاگو گے۔"

مَیں نے کندھے جھٹک دیئے۔ "یہی تو تمہارا جوا ہے۔ جیت میں ۳۰ فیصد کے حصے دار یونہی تو نہیں بنو گے لیکن ایسا ہوگا نہیں۔ میرا ہارنے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"ہارنے کا ارادہ کسی کا بھی نہیں ہوتا۔"

"تم سیدھی بات بتاؤ۔ کسی بکی کو جانتے ہو یا نہیں؟"

میڈوک مجھے متجسس نظروں سے گھورتا رہا۔ "سیونٹی، تھرٹی؟ یہی کہہ رہے ہو نا تم؟"

"ہاں۔"

اس نے سر جھٹکا اور ایک سرد آہ بھرتے ہوئے پوچھا۔ "کیش تمہارے پاس موجود ہے؟"

☆==========☆==========☆

ہفتے کی اس سہ پہر نارتھ ڈریورڈ ہلز روڈ کا وہ بار پیک تھا۔ میں بار میں داخل ہوا تو ٹی وی پر ریس شو سے پہلے کے کمرشل دکھائے جا رہے تھے۔ ولکنسن سورڈ والے اپنے سب سے نئے پروڈکٹ سٹین لیس سٹیل کے بلیڈ کی تشہیر کر رہے تھے۔

مَیں اپنی توقع سے زیادہ نروس تھا۔ منصوبہ بندی کی حد تک تو سب ٹھیک تھا لیکن کون جانے، کہاں کوئی گڑبڑ ہو جائے۔ ویسے مَیں نے گزشتہ ہفتے کے واقعات پر نظر رکھی تھی۔ میرا خیال تو یہی تھا کہ وہ اسی انداز میں رونما ہوئے ہیں جیسے میری یادداشت میں تھے لیکن یادداشت پر بہت زیادہ انحصار تو نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ واقعات تیس سال پرانے ہوں جبکہ خود میری زندگی عملاً تبدیل ہو رہی تھی۔ مَیں کلاسیں اٹینڈ کرنے کے بجائے شرطوں کے .... دولت کمانے کے چکر میں لگا ہوا تھا۔

ایسے میں یہ ناممکن نہیں تھا کہ اس ریس کا انجام مختلف نکلے اور ایسا ہوا تو مَیں اپنی ہر چیز سے محروم ہو جاؤں گا اور پھر امریکہ میں رہنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ کالج سے بھی نکال دیا جاؤں گا اور اس کے بعد تعلیم ہونے کے باوجود ڈگری نہ ہونے کی وجہ سے جاب

کھلاؤں گا۔

"ہے چارلی............" کسی نے چیخ کر کہا۔ "ایک ڈبل پیگ کا راؤنڈ میری طرف سے سب کے لئے۔ گھوڑوں کے گیٹ چھوڑنے سے پہلے۔"

اس پر تالیاں بجیں۔ بار میں موجود لوگ ہنس رہے تھے۔ آرڈر دینے والے کے ساتھی نے کہا۔ "تم رقم جیتنے سے پہلے ہی خرچ کر رہے ہو۔"

"رقم تو میری جیب میں ہی سمجھو۔" اس شخص نے کہا۔ "سمجھ لو کہ میں شرط جیت چکا ہوں۔"

ٹی وی سکرین پر اب بے چین .... دوڑنے کے لئے مضطرب گھوڑے نظر آ رہے تھے۔

"اب کچھ بھی ہو سکتا ہے دوست!" کوئی بولا۔ "گھڑ دوڑ دنیا کی سب سے بڑی بے وفائی کا نام ہے۔"

بارٹینڈر نے آرڈر کے مطابق سب کے سامنے بڑے جام رکھے دیئے۔ میرے جام اٹھانے سے پہلے گھوڑے اپنے اپنے گیٹ سے نکل چکے تھے۔ نیوربینڈ کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے جسم میں برقی رو دوڑ رہی ہے۔ نورابری تقریباً اس کے ساتھ تھا۔ کینڈی سالٹ اور ولدا شیکر ان کے پیچھے تھے۔ پہلے ٹرن پر وہ دونوں تین لینتھ پیچھے دوڑ رہے تھے۔

چیئیوگے کا نمبر چھٹا تھا۔ ابھی ایک میل کا فاصلہ باقی تھا اور وہ دس لینتھ پیچھے تھا۔

مَیں نے تمام مشروب ایک گھونٹ میں پینے کی کوشش کی۔ مجھے پھندا لگ گیا۔

آگے دوڑنے والے آدھے میل کا پول کراس کر چکے تھے۔ چیئیوگے نے ابھی تک درمیانی فاصلے میں ایک انچ کی بھی کمی نہیں ہونے دی تھی۔

میرا بہت برا حال تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے پاس صرف بیس ڈالر رہ جائیں گے۔ پھر میں کیا کروں گا۔ ابو اور امی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ کیسے بتاؤں گا کہ یہ سب کچھ کیونکر ہوا۔ نہیں .... واپس جانے سے بہتر یہ ہو گا کہ یہیں ڈش واشنگ کرکے کسی نہ کسی طور تعلیم جاری رکھوں۔

لوگ سکرین کی طرف رخ کر کے یوں چیخ رہے تھے جیسے ان کی آواز گھوڑوں اور

جوکیوں تک پہنچ رہی ہو۔ حالانکہ ریس چار سو میل دور ہو رہی تھی۔ مَیں نے ایک نظر کے بعد سکرین کی طرف دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ بیک سٹریچ تک پہنچتے پہنچتے چیپوگے کچھ تیز ہوا تھا لیکن جہاں تک ریس کا تعلق تھا، ریس ختم ہو چکی تھی۔

اگلے ٹرن پر ولی شو میکر نے کینڈی سپائس کو ریلنگ کے ساتھ والی سائیڈ سے اوورٹیک کر لیا۔ چیپوگے اب چوتھی پوزیشن پر تھا۔ تین لینتھ پیچھے۔ اب اس پوزیشن کے ساتھ اس کے جیتنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کوارٹر پول پر اچانک نورابری کے انداز سے تھکن ظاہر ہونے لگی۔ جنگ کے آخری مرحلے کے لئے اس میں حوصلہ نہیں رہا تھا۔ وہ پیچھے رہ گیا۔ اب نیوربینڈ اور کینڈی سپائس وننگ پوسٹ کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ولی شو میکر میں بھی جان نہیں رہی تھی۔

اچانک چیپوگے نے فیورٹ گھوڑے کینڈی سپائس کو اوورٹیک کیا۔ انداز سے لگتا تھا کہ نیوربینڈ اس کا اگلا ہدف ہے۔ وہ جاں فشانی سے دوڑ رہا تھا۔

بار میں اب بلوے کا سماں تھا۔ مَیں خاموش تھا۔ دل بھی جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ مجھے احساس نہیں تھا کہ میں نے جام کو کتنی سختی سے پکڑا ہوا ہے۔

چیپوگے نے سوا لینتھ کی سبقت سے ریس جیت لی۔ نیوربینڈ دوسرے نمبر رہا۔ کینڈی سپائس کی تیسری پوزیشن تھی۔

میری یادداشت نے کام دکھا دیا تھا۔ مَیں جیت گیا تھا!

سب کو جام پلانے والا اب کینڈی سپائس اور اس کے جوکی پر یوں برس رہا تھا جیسے وہ اس کے سامنے کھڑے ہوں لیکن مَیں کچھ نہیں سن رہا تھا، میری نظریں ٹی وی سکرین پر مرکوز تھیں۔ میں ٹوٹل بورڈ پر دکھائی جانے والی فگرز کا منتظر تھا۔

چیپوگے نے ۲۰ء۸۰ ڈالر کے بھاؤ پر ریس جیتی تھی۔ میرا ہاتھ اپنی کیسیو کیلکولیٹر واچ کی طرف بڑھا۔ پھر مَیں خود ہی ہنس دیا۔ ابھی ان گھڑیوں کی ایجاد برسوں بعد ہونا تھی۔ مَیں نے بار سے کاک ٹیل نیپکن اٹھایا اور بال پوائنٹ سے اس پر حساب شروع کر دیا۔ ۲۳۰۰ ضرب ۲۰ء۸۰ کا نصف۔ اس میں سے فرینک میڈوک کا ۳۰ فیصد نکالنے کے بعد پتہ چلا کہ میں نے تقریباً سترہ ہزار ڈالر جیتے تھے۔ واہ۔

مگر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میری یادداشت جیت گئی تھی اور نہ ۹۳ء تک کا

عرصہ میرا وہم تھا اور نہ ہی ۶۳ء کی موجودہ زندگی کوئی خواب۔ سب حقیقت تھا۔ میری عمر اٹھارہ سال تھی اور آئندہ تیس برس میں رُونما ہونے والا ہر بڑا اور اہم واقعہ میری یادداشت میں محفوظ تھا۔

☆==========☆==========☆

میں تاش کے پتے لئے فرینک میڈوک کو وہ شعبدہ بازیاں سکھا رہا تھا جو ابھی کسی کو نہیں آتی تھیں۔ وہ سب ۷۰ء کی دہائی کے کرتب تھے۔ ۶۳ء میں کسی نے ان کے بارے میں سوچا بھی نہیں ہوگا۔

”زبردست!“ فرینک نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”ہم دونوں ایک ٹیم ہیں......... ایک ناقابل شکست ٹیم۔“

”بیئر پیو گے؟“

”کیوں نہیں۔“

میں اٹھ کر میز پر رکھے ہوئے کولر کی طرف گیا۔ کمرہ پہلی منزل پر تھا۔ پردے اٹھے ہوئے تھے۔ مَیں نے بڑی محبت سے اپنی نئی کار کو دیکھا۔ وہ گرے کلر کی سٹیوڈ بیکر اوانتی تھی جو نکم کاری موٹیل کے پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی......... چمکتی دمکتی کار۔

اٹلانٹا سے یہاں تک اس کار کو ستائشی نظروں سے دیکھا گیا تھا اور ستائشی تبصرے کئے گئے تھے۔ مَیں جانتا تھا کہ لاس ویگاس تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ مَیں نے وہ کار اس لئے خریدی تھی کہ اس میں مستقبل کی کاروں کی جھلک نظر آتی تھی۔ یوں سمجھیں کہ وہ بعد میں منظر عام پر آنے والی جدید سپورٹس کاروں کا نقطۂ آغاز تھا۔

”ہے......... تم تو بیئر لا رہے تھے۔“ فرینک کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”لا رہا ہوں۔“

مَیں نے فرینک کو ٹھنڈی بیئر دی اور خود بھی ایک طویل گھونٹ لیا۔ مئی کے اواخر میں فرینک کے گریجویشن کے فوراً بعد ہم نکل کھڑے ہوئے تھے۔ مَیں نے تو کلاس کا رخ کرنا بہت پہلے سے چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اب تعلیم کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ فرینک جنوبی روٹ پر سفر کرتا اور راستے میں چند روز نیو آرلینز میں رک کر جشن منانا چاہتا تھا لیکن میں ڈائریکٹ منزل پر پہنچنے پر مصر رہا تھا۔

اب میرا ذہنی الجھاؤ اور ڈپریشن دور ہو چکا تھا۔ اب میرے ذہن میں وہ سوالات نہیں ابھرتے تھے جن کے جواب نہیں مل سکتے تھے۔ مَیں نے صورت حال کو جہاں ہے اور جیسی ہے کی بنیاد پر قبول کر لیا تھا۔ اب مجھے یہ خوف بھی نہیں تھا کہ صبح سو کر اٹھوں گا تو دوبارہ ۹۳ء میں ہوں گا۔

فرینک مجھ سے پوچھتا رہا تھا کہ مجھے چیپیوگے کے جیتنے کا اندازہ کیسے ہوا۔ مَیں اسے معقولیت سے ٹالتا رہا تھا۔ اس نے اپنے طور پر یہ فرض کر لیا تھا کہ مَیں کوئی ترقی یافتہ چھٹی حس رکھنے والا جینئس ہوں۔ یا پھر مَیں نے ایسی باتوں کو جاننے کے لئے کوئی حسابی طریقہ دریافت کر لیا ہے۔ اس کا یہ خیال اس وقت اور اہمیت اختیار کر گیا جب مَیں نے اس کے مسلسل اصرار کے باوجود پریکنیس کی ریس میں شرط لگانے سے انکار کر دیا۔ یہ ریس ڈربی کے دو ہفتے بعد ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ چیپیوگے اس سال کے ٹرپل کراؤن کی تین ریسوں میں سے دو میں جیتے گا۔ ایک ریس وہ جیت چکا تھا۔ اب مجھے یہ یاد نہیں تھا کہ اس نے دوسری ریس جیتی تھی یا تیسری اور میں ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے پریکنیس کی ریس کو نظرانداز کر دیا۔ فرینک میرے اس فیصلے سے خوش نہیں تھا۔

لیکن یہ ہر لحاظ سے اچھا ہی ہوا۔ پریکنیس کی ریس کینڈی سپاٹس نے ساڑھے تین لینتھ .... کی سبقت سے جیتی۔ اب نہ صرف یہ کہ مجھے بیلمونٹ کی ریس میں چیپیوگے کی جیت کا یقین تھا بلکہ کینڈی سپاٹس نے اپنا اعتماد پھر بحال کر دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں چیپیوگے کا بھاؤ بہت بہتر ہو گیا تھا۔

فرینک نے بکھرے ہوئے پتے سمیٹے۔ "تمہارے خیال میں اب میں بلیک جیک میں مال بنا سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"اوسان ٹھکانے رکھے تو تم یقیناً جیتو گے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم خود نہیں کھیلو گے۔"

"نہیں۔ میں تاش کے پتوں پر کبھی اعتبار نہیں کر سکتا۔"

"حیرت ہے۔" فرینک نے کہا۔ وہ یقیناً کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے ارادہ بدل دیا .... اور موضوع [illegible]ی۔ "راستے میں جو ڈرائیو اِن نظر آئے تھے، ان میں سے ایک میں ڈاکٹر نو [illegible]گی ہوئی ہے، کیا خیال ہے؟"

"بھائی ایک بات بتاؤ۔ تم جیمز بانڈ کی یہ فلم کتنی بار دیکھ چکے ہو؟" مَیں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

"تین یا چار بار۔ اور ہر بار یہ فلم پہلے سے اچھی لگتی ہے۔"

"بہت ہے۔ جیمز بانڈ سے میرا تو دل بھر چکا ہے۔"

"کیا.......... کیا مطلب؟" اس نے الجھن بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔

"کچھ نہیں"۔ میں نے جلدی سے کہا "بس .... میرا موڈ نہیں ہے فلم کا۔ تم کار لے جاؤ۔ چابیاں ٹی وی پر رکھی ہیں۔"

"بات کیا ہے۔ پوپ کا سوگ منا رہے ہو۔ تم تو مسلمان ہو بھائی۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کرسی کے نیچے رکھے جوتوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "چلو بھائی چلتا ہوں۔ شکر ہے کہ اس میں راجر مور نہیں ہے۔"

"راجر مور؟ یہ کون بلا ہے؟" فرینک پھر الجھنے لگا۔

"کبھی وہ سینٹ کا کردار ادا کرے گا۔"

فرینک نے سر جھٹکا۔ "پتہ نہیں تم کہاں کی ہانک رہے ہو۔ کبھی کبھی تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"فرینک .... کبھی کبھی تو میں خود بھی نہیں سمجھ پاتا اپنی بات۔ خیر چلو .... فلم دیکھیں .... حقائق سے فرار کی بہت اچھی دوا ہے فلم۔ اس وقت ہمیں ضرورت بھی ہے۔"

☆==========☆==========☆

اگلے روز ہم لاس ویگاس پہنچ گئے۔ ہم باری باری ڈرائیو کرتے رہے تھے۔ مَیں پہلے کبھی لاس ویگاس نہیں گیا تھا۔ وہ ہاورڈ ہیوز سے پہلے کا لاس ویگاس تھا، جب ہلٹن اور ایم جی ایم کی دولت نے بڑے اور معزز ہوٹل، کیسینو تعمیر نہیں کئے تھے۔ وہ پرانی فلموں میں نظر آنے والا لاس ویگاس تھا۔

ہم نے فلمنگو میں قیام کیا اور ہوٹل کے کیسینو میں ۱۶ ہزار ڈالر ڈیپازٹ کرائے۔ اسسٹنٹ مینیجر کی تو باچھیں کھل گئیں۔ اس نے ہمیں تین کمروں کا سوئٹ دیا۔ قیام کے دوران ہمارا کھانا اور ڈرنکس ہوٹل کے ذمے تھے۔

فرینک نے شام بلیک جیک کی میزوں کا جائزہ لیتے گزاری۔ کتنی گڈیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ اصول و ضوابط کیا ہیں۔ ڈیلرز کس طرح کے ہیں۔ میں بھی یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ مگر جلد ہی بور ہو گیا۔ چنانچہ میں کیسینو دیکھتا پھرا۔ وہاں کی ہر چیز.......... ماحول مجھے غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ بھاری رقموں کے رنگین چپس کی ڈھیریاں، بھڑکیلے لباس پہنے ہوئے عورتیں اور مرد.......... نگاہوں میں کھلی ہوس۔

مَیں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جیک پار شو دیکھتے دیکھتے مجھے نیند آ گئی۔ صبح میں بیدار ہوا تو فرینک میڈوک کو سوئٹ کے لونگ روم میں ٹہلتے پایا۔ شاید وہ ذہن میں میری بتائی ہوئی ترکیبیں دہرا رہا تھا۔

باتھ روم سے نکلنے کے بعد میں نے فرینک سے پوچھا۔ "ناشتہ کرو گے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مَیں مزید پریکٹس کرنا چاہتا ہوں۔ دوپہر سے پہلے حملے کا ارادہ ہے۔ اس وقت ڈیلرز تازہ دم نہیں ہوتے۔"

"بہت مناسب خیال ہے۔ گڈ لک۔" میں نے کہا۔ "مَیں شاید سوئمنگ پول کے پاس ملوں۔ بتانا کہ کیا رہا۔"

مَیں نے ہوٹل کے ریستوران میں ناشتہ کیا۔ ناشتے کے دوران میں ریسنگ فارم پڑھتا رہا۔ بیلمونٹ میں چیپیوگے کا بھاؤ اور گر رہا تھا۔ یعنی ہماری جیت کی رقم بڑھ رہی تھی۔ اخبار میں اور بھی کئی ریسوں کی تفصیل تھی لیکن مَیں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ لہٰذا وہ میرے لئے بیکار تھیں۔

مَیں نے بہت ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ حالانکہ پچھلے چند برسوں میں.......... میرا مطلب ہے ۸۹ء کے بعد سے مَیں نے ناشتہ کرنا چھوڑ ہی دیا تھا لیکن ۶۳ء میں میرا ۱۸ سالہ جسم زیادہ خوراک کا تقاضا کرنے میں حق بجانب تھا۔

مَیں باتھنگ سوٹ تبدیل کرنے کے لئے کمرے میں گیا تو فرینک کیسینو جا چکا تھا۔ مَیں نے بڑا تولیہ لیا اور سوئمنگ پول کا رخ کیا۔ وہاں مَیں پول کے کنارے پڑی ایک لاؤنجنگ چیئر پر قابض ہو گیا۔

چند ہی لمحے بعد میری نظر اس خوبصورت اور خوش بدن لڑکی پر پڑی۔ اس کے بھیگے ہوئے بال بتا رہے تھے کہ وہ ابھی پو[illegible] سے نکلی ہے۔ وہ مسکرائی تو جیسے دھوپ میں جان پڑ

گئی۔ پھر وہ میری طرف چلی آئی۔ "ہائی" اس نے کہا۔ "اس کرسی پر کوئی بیٹھا ہے کیا؟" اشارہ برابر والی کرسی کی طرف تھا۔

مَیں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کرسی میں دراز ہو گئی اور تولئے سے بال خشک کرنے لگی۔

مَیں نے اپنی نگاہوں کو دانستہ اس کے سراپا پر بھٹکنے کی اجازت دے دی۔ پھر مَیں نے پوچھا۔ "کچھ پیو گی؟"

"نہیں، بہرحال پیشکش کا شکریہ۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ "ابھی کچھ دیر پہلے میں نے بلڈی میری کا جام لیا تھا اور گرمی کی وجہ سے مجھے چکر بھی آ رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے، تم گرمی کی عادی نہیں ہو۔ کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"الی نوائس، شکاگو کی لیکن کئی ماہ سے یہاں ہوں اور ابھی خاصے عرصے رہوں گی۔ تم اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"مَیں اٹلانٹا میں رہتا ہوں۔" مَیں نے کہا۔ میں پاکستان کا حوالہ نہیں دینا چاہتا تھا "میرا تعلق ایموری سے ہے۔"

"تم گرمی اور دھوپ کے عادی معلوم ہوتے ہو۔"

"وہ تو میں ہوں۔" میں نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"تعارف نہیں کراؤ گے؟"

"ایفاک۔" میں نے اپنے نام کو امریکی تاثر دیا۔ "ایفاک عباسی۔"

"انوکھا نام ہے۔" وہ پُر خیال لہجے میں بولی۔ پھر اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کی کسی انگلی میں انگوٹھی نہیں تھی۔ "میں شرلا بیکر ہوں۔" وہ بولی۔ "اٹلانٹا میں تم کیا کرتے ہو؟"

"میں کالج میں پڑھ رہا ہوں۔ جرنلزم کی ڈگری لینا چاہتا ہوں۔"

وہ خوش دلی سے مسکرائی۔ "تو تم کالج بوائے ہو۔ تمہارے والد بہت دولت مند ہوں گے۔ تمہیں کالج میں بھی پڑھا رہے ہیں اور تمہیں لاس ویگاس بھی بھیجا ہے تفریح کے لئے۔"

"یہ بات نہیں۔" میں نے کہا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کی عمر ۲۲ یا ۲۳ سال ہو گی لیکن میں عمر کا فرق معکوس محسوس کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے آدھی عمر کی تھی۔ "یہاں میں خود آیا ہوں .... اپنے زور پر" میں نے مربیانہ لہجے میں کہا۔ "میں نے کینٹکی ڈربی میں تگڑی رقم جیتی تھی۔"

وہ متاثر نظر آنے لگی "اچھا سنو .... تمہارے پاس کار ہے یہاں۔"

"ہاں، کیوں؟"

اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر خطرناک انداز میں انگڑائی لی۔ میری دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں۔ "کیوں نہ کہیں سیر کو چلیں۔ لیک میڈ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ بولی۔

مجھے وہ خیال بہت ہی مناسب لگا۔

☆==========☆==========☆

شرلا، نیکی نامی ایک لڑکی کے ساتھ رہتی تھی۔ نیکی شام چار بجے سے رات بارہ بجے تک ائرپورٹ کے انفارمیشن بوتھ میں کام کرتی تھی۔ شرلا میرے خیال میں کچھ نہیں کرتی تھی۔ رات کو وہ کیسینو میں منڈلاتی۔ اس کی دوپہریں ہوٹلوں کے سوئمنگ پول میں گزرتیں۔ وہ کوئی پیشہ ور لڑکی نہیں تھی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو لاس ویگاس میں اچھا وقت گزارنے کی خواہشمند رہتی ہیں۔ کوئی چھوٹا موٹا تحفہ دے دے یا کوئی جیتنے والا جواری مٹھی بھر چپس دے دے تو وہ برا نہیں مانتیں۔

مَیں نے اگلے چار دن اس کے ساتھ گزارے۔ اسے چھوٹے موٹے کئی تحفے خرید کر دیئے۔ اس نے رقم مجھ سے ایک بار بھی نہیں مانگی۔ ہم نے خوب تفریح کی۔ ڈیزرٹ اِن میں فرینک سناترا کا شو دیکھا۔ جھیل میں کشتی رانی کی۔ لمبی ڈرائیو پر بھی گئے۔ بلقیس سے شادی کے بعد وہ پہلا موقع تھا کہ میں بے وفائی کا مرتکب ہوا۔ بشرطیکہ اسے بے وفائی کہا جا سکے۔

دوسری طرف فرینک میڈوک پیشہ ور عورتوں سے استفادہ کر رہا تھا، جو لاس ویگاس میں بکثرت پائی جاتی تھیں لیکن ان کا زیادہ وقت بلیک جیک کی میزوں پر گزرتا تھا۔ بیلمونٹ کی ریس والے دن تک وہ بلیک جیک میں نو ہزار ڈالر سے زائد رقم جیت چکا تھا۔

اس نے بڑی فراخ دلی سے اس میں سے تین ہزار ڈالر مجھے دے دیئے کیونکہ رقم وہ میری ہی وجہ سے جیتا تھا۔ اب ہمارے پاس مشترکہ سرمایہ ۲۵ ہزار ڈالر تھا۔ فرینک گھبرا ضرور رہا تھا لیکن میرے اصرار پر وہ تمام رقم ایک ہی ریس پر لگانے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

ہفتے کو بیلمونٹ کی ریس کے دن میں فلیمنگو کے سوئمنگ پول پر شرلا کے ساتھ بیٹھا تھا۔ شرلا نے پوچھا۔ "تم یہ ریس ٹی وی پر بھی نہیں دیکھو گے؟"

"اس کی ضرورت نہیں۔ مَیں نتیجے سے واقف ہوں۔" مَیں نے کہا۔

"اوہو .... امیر کالج بوائے۔ تو تم سب کچھ جانتے ہو۔" وہ ہنسنے لگی۔

"نہ جانتا ہوتا تو مَیں امیر نہ ہوتا۔"

"تم جانو۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

ہم وہیں بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد فرینک ہوٹل سے باہر آیا۔ اس کے چہرے پر شاک کا تاثر تھا۔ اس تاثر نے مجھے لرزا دیا۔ میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سب سے پہلے جو خیال میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ ہمیں ساری رقم اس ایک ریس پر نہیں لگانی چاہئے تھی۔ "کیا ہوا فرینک؟ کیا بات ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اتنی بڑی رقم۔ او کرائسٹ۔" اس کی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔

مَیں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ "ہوا کیا ہے؟ مجھے صاف صاف بتاؤ۔"

اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھوٹی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "ہم جیت گئے۔"

"کتنی رقم؟"

"ایک لاکھ ۷۳ ہزار ڈالر۔"

میں نے اس کے کندھوں پر رکھے ہاتھ نیچے گرا دیئے۔ میں پُرسکون ہو گیا تھا۔

"تم یہ کیسے کرتے ہو؟" فرینک نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "یہ کوئی جادو ہے؟ آخر کیا کرتے ہو تم؟ مسلسل تین بار ایسا ہو چکا ہے تین بار!"

"بس .... خوش قسمتی ہے ہماری۔"

"بکواس .... ڈربی میں تم نے ڈینیوگے پر شرط لگانے کے لئے اپنا سب کچھ داؤ

پر لگا دیا تھا۔ ہار جاتے تو تمہارے پاس خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا۔ مگر تمہیں پورا یقین تھا اور تم مجھے جواری بھی نہیں لگتے۔ تم کچھ جانتے ہو لیکن بتانا نہیں چاہ رہے ہو۔"

شرلا دانتوں سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے مجھے پُرخیال نظروں سے دیکھ رہی تھی

"تم نے کہا تھا کہ تم اس ریس کے انجام سے واقف ہو۔" اس نے الزام دینے والے لہجے میں کہا۔

یہ گفتگو جس نہج پر جا رہی تھی وہ میرے لئے خوشگوار نہیں تھا۔ "ہے.........." مَیں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے، اگلی بار ہم سب کچھ ہار جائیں۔"

فرینک کے دانت نکل پڑے۔ لگتا تھا، اس کا تجسّس دب گیا ہے۔ "اس ٹریک ریکارڈ کے ساتھ تو میں تمہارے پیچھے جہنم میں بھی چلا جاؤں گا۔ یہ بتاؤ اب کہاں حملہ کرو گے؟ تمہاری چھٹی حس کوئی اور اطلاع دے رہی ہے؟"

"ہاں، مجھے اطلاع ملی ہے کہ شرلا کی روم میٹ آج اپنے آفس فون کرے گی کہ طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے ڈیوٹی پر نہیں آسکے گی۔ اس کے نتیجے میں ہم چاروں مل کر جشنِ فتح منائیں گے۔ فی الوقت تو مَیں بس اسی پر شرط لگا سکتا ہوں۔" مَیں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

فرینک ہنسنے لگا۔ "مَیں شیمپین لے آؤں۔" اس نے کہا اور بار کی طرف چل دیا۔

شرلا اپنی روم میٹ کو فون کرنے چلی گئی۔ مَیں لاؤنج چیئر میں دراز ہو گیا۔ اس وقت مجھے خود پر بہت شدت سے غصہ آ رہا تھا۔ اس قدر احمقانہ گفتگو کرتا رہا تھا مَیں۔ اب مَیں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ فرینک کو کیسے بتاؤں کہ شرطوں کی یہ پارٹنرشپ اب ختم ہو چکی ہے .... کم از کم موسم گرما تک کے لئے۔ اب مَیں یہ اعتراف تو نہیں کر سکتا تھا کہ اب اس سال کی ریسوں پر شرط نہیں لگائی جا سکتی۔ کیونکہ مجھے یاد نہیں کون سی ریس کون سا گھوڑا جیتا تھا۔

☆==========☆==========☆

مَیں انجوائے بھی کرنا چاہتا تھا اور فرینک کے مسلسل اصرار سے بھی بچنا چاہتا تھا۔ چنانچہ مَیں شرلا کے ساتھ پیرس چلا گیا۔ وہاں ہم نے بہت اچھا وقت گزارا۔ پیرس سے واپسی پر مَیں فرینک سے ملا۔ "کہو پیرس کیسا رہا؟" فرینک نے پوچھا۔

"بہت اچھا۔ پیرس زندگی اور اس کی رنگینیوں سے معمور شہر ہے۔" مَیں نے کہا اور کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ ہم اس وقت پلازہ ہوٹل کے اوک روم میں بیٹھے تھے۔

"ہمیں تفریح کی ضرورت بھی تھی۔"

فرینک نے اپنے لئے بوربن اور میرے لئے جیک ڈینیل منگوائی۔ "لاء سکول کے پہلے سال میں یہاں آنے اور بیٹھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔" اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔"

"شرلا تمہارے ساتھ ہے؟"

"ہاں۔ وہ آج فلم دیکھے گی۔ میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ ہماری یہ ملاقات کاروباری معاملات کے لئے ہے۔"

"یعنی تم دونوں بہت ٹھیک ٹھاک جا رہے ہو۔"

"وہ زندہ دل لڑکی ہے۔ اس کی قربت میں لطف آتا ہے۔"

فرینک نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ اس وقت ویٹر ہمارے سامنے مشروب رکھ گیا

"اور وہ جوڈی؟"

"اس سے تو مَیں امیر ہونے کے بعد ملا ہی نہیں۔ پیاری لڑکی ہے وہ لیکن شرمیلی .... اور بہت کم عمر۔"

"کم عمر؟" فرینک نے حیرت سے کہا۔ "میرا خیال ہے، وہ تمہاری ہم عمر ہے۔"

میں نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔ "تم پھر بڑے بھائی بن رہے ہو۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ شرلا نہ میری ہم عمر ہے نہ ہی میرے لئے مناسب ہے؟"

"نہیں، یہ بات نہیں۔ میں تو بس .... بات یہ ہے کہ تم حیران کن لڑکے ہو۔ پہلی بار تم مجھ سے ملے تو میں نے سوچا، اس لڑکے کو ابھی گھڑ دوڑ اور زندگی کے دوسرے معاملات کے متعلق بہت کچھ سیکھنا ہے لیکن ہوا یہ کہ تم مجھے سکھانے لگے۔ استاد بن گئے میرے۔ کتنی دولت بنائی ہم نے شرطوں سے۔ تم نے وہ کار خریدی اور پھر شرلا کے ساتھ پیرس چلے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ کبھی کبھی تم اپنی عمر سے بہت بڑے لگتے ہو۔"

"میرا خیال ہے، اب ہمیں موضوع بدل دینا چاہئے۔" مَیں نے تند لہجے میں کہا۔

"دیکھو .... میرا مقصد تمہاری توہین کرنا ہرگز نہیں تھا۔" اس نے جلدی سے کہا "شرلا زبردست دریافت ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے تم پر رشک آتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے کسی کو اتنی تیزی سے مجبور ہوتے نہیں دیکھا۔ غلط نہ سمجھنا۔ یہ میں تمہاری تعریف کر رہا ہوں۔ بہرحال بات عجیب سی ہے۔"

مَیں نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے اپنے ذہن سے کشیدگی کو جھٹک دیا۔ "میرا خیال ہے، میری زندگی کی بھوک بہت توانا ہے۔ مَیں جلد از جلد سب کچھ کر لینا چاہتا ہوں۔"

"سٹارٹ تم بہت اچھا لے چکے ہو۔ کاش کامیابی کی رفتار یہی رہے۔"

"شکریہ۔" میں نے کہا۔

"ابھی تم نے کہا تھا کہ تم نے شرلا کو بتایا ہے کہ یہ کاروباری ملاقات ہے۔"

"یہ درست ہے۔"

فرینک نے اپنے جام سے ایک گھونٹ لیا۔ "تو پھر ہو جائے کوئی کاروباری بات۔"

"وہ تو ہو جائے گی۔ مگر پہلے ایک بات طے ہو جائے۔"

"بولو۔"

"اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ میری تجویز میں تم دلچسپی لیتے بھی ہو یا نہیں۔"

"اب تک جو کچھ ہو چکا ہے، اس کے بعد میں تمہاری خرافات پر بھی پوری توجہ دوں گا۔" فرینک نے کہا۔

"لیکن میری اس تجویز کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تمہارے ہوش اُڑ جائیں گے سن کر۔"

"چلو .... تجربہ کر دیکھو۔"

"اب سے دو ہفتے بعد ورلڈ سیریز کے فائنلز ہیں۔"

"تمہارا سابقہ ریکارڈ بتاتا ہے کہ تم ڈوجرز پر شرط لگاؤ گے۔"

میں نے چند لمحے توقف کیا۔ پھر بولا۔ "تم ٹھیک سمجھے ہو۔"

"ہے .... مَیں تو یونہی کہہ رہا تھا۔ سنجیدگی سے بات کرو۔" فرینک بوکھلا گیا "دیکھو، ڈربی اور بیلمونٹ میں تمہارا فلوک لگ گیا لیکن اب سنجیدہ ہو جاؤ۔ مینٹل اور

مارس فٹ ہو گئے ہیں اور پھر پہلے دو گیم نیویارک میں ہوں گے۔ ڈوجرز کا کوئی چانس نہیں ہے دوست۔"

میں نے گہری سانس لے کر کرسی سے پیٹھ ٹکا دی۔ "جو میں کہہ رہا ہوں وہی ہو گا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "اور یہ شٹ آؤٹ ہو گا۔ ڈوجرز سٹریٹ چار گیم جیتیں گے۔"

فرینک نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "تم پاگل ہو گئے ہو۔"

"نہیں دوست۔ یہی ہونا ہے ون، ٹو، تھری، فور .... اور ہم زندگی بھر کے لئے پیسے کی فکر سے آزاد ہو جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے، ہم وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے۔"

میں نے اپنا جام خالی کر کے میز پر رکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ فرینک مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ "ہاں چھوٹی شرط لگائی جا سکتی ہے۔" وہ بولا۔ "دو ہزار .... چلو پانچ ہزار ڈالر سہی، اگر تمہیں اتنا ہی یقین ہے۔"

"نہیں، سب کچھ۔"

فرینک بدستور مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ "مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ۔ ہارنا چاہتے ہو؟ دیکھو قسمت بھی ایک حد تک ہی ساتھ دیتی ہے۔"

"اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے فرینک۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ میں اس پر لگا رہا ہوں۔ انہی پرانی شرائط پر۔ شرط تم لگاؤ گے۔ جیتنے کی صورت میں تیس فیصد تمہارا۔ یوں تمہیں کوئی رسک بھی نہیں لینا پڑے گا۔"

"تمہیں اندازہ ہے کہ بھاؤ کیا ہو گا؟"

"نہیں، تمہیں کچھ اندازہ ہے؟"

"نہیں، لیکن یہ جانتا ہوں کہ پاگل کر دینے والا بھاؤ ہو گا۔ اس لئے کہ کوئی پاگل ہی ڈوجرز کے حق میں شرط لگا سکتا ہے۔"

"فون کر کے معلوم کیوں نہیں کر لیتے۔ پوزیشن کا علم تو ہونا چاہئے۔"

"معلوم کروں گا..........."

"تو جاؤ، معلوم کرو۔ میں اور ڈرنک منگواتا ہوں اور ہاں صرف ڈوجرز کے جیتنے کا نہیں .... ان کے کلین سویپ کا بھاؤ معلوم کرنا۔"

دس منٹ بعد فرینک واپس آیا۔ "میرا بکی ہنس رہا تھا مجھ پر۔" اس نے بیٹھ کر اپنے ڈرنک کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مذاق نہیں، وہ واقعی ہنستے ہنستے پاگل ہو گیا۔"

"مجھے بھاؤ بتاؤ۔" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

فرینک نے ایک ہی سانس میں اپنا آدھا مشروب حلق میں اتار لیا۔ "ایک پر سو کا بھاؤ ہے۔"

"تو تم میری طرف سے شرط لگاؤ گے؟"

"یعنی تم مذاق نہیں کر رہے ہو۔ سیریس ہو؟ یہ کر کے ہی رہو گے۔"

"جتنا سنجیدہ میں ہوں اس سے زیادہ سنجیدہ انسان صرف مر کر ہی ہو سکتا ہے۔"

"تمہیں ان معاملات میں آخر خود پر اتنا یقین کیوں ہوتا ہے۔" وہ جھنجلا گیا۔ "تم ایسی کیا بات جانتے ہو جو دنیا میں کسی اور کو معلوم نہیں۔"

میں نے پلکیں جھپکائیں۔ "بس کوئی انجانی حس ہے جو میری رہنمائی کرتی ہے لیکن یہ رہنمائی کبھی غلط نہیں ہوتی۔"

"عجیب بات ہے۔ شک میں مبتلا کرنے والی........."

"میں قسم کھا سکتا ہوں کہ غیر قانونی نوعیت کی کوئی بات نہیں۔"

"تم ایسے بات کرتے ہو جیسے بہت کچھ جانتے ہو۔"

"میں بس اتنا جانتا ہوں کہ ہم یہ شرط نہیں ہار سکتے۔ یہ یقین ہے کہ ہم جیتیں گے۔"

فرینک مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک اور گھونٹ میں اپنا جام خالی کر دیا۔ پھر اس نے ویٹر کو ایک اور جام لانے کا اشارہ کیا۔ "تم سے ملنے سے پہلے میں نے سوچا تھا کہ اس سال میری گزر اوقات سکالر شپ پر ہو گی۔" اس نے مجھ سے کہا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب یہ کہ میں اس احمقانہ سکیم میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ میں پرانے حال کو پہنچ جاؤں گا لیکن یہ جو عیاشی کی ہے یہ بونس کہلائے گی اور یہ

سب کچھ بھی تو تمہاری ہی بدولت ہوا تھا لیکن ایک شرط ہے میری۔"

"بتاؤ۔"

"اب یہ سیونٹی تھرٹی کی بات کبھی نہ کرنا۔ ہم دونوں مل کر شرط لگائیں گے۔ رسک برابر کا اور پارٹنر شپ بھی ففٹی ففٹی کی، او کے؟"

"او کے پارٹنر۔"

☆==========☆==========☆

وہ اکتوبر ڈوجرز کے کوفیکس اور ڈرائزڈیل کا تھا۔

پہلے دو گیمز میں نے شرلا کے ساتھ یانکی سٹیڈیم میں دیکھے۔ جبکہ فرینک کی وہ گیم ٹی وی پر دیکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ ڈوجرز نے پہلا گیم کوفیکس کی پچنگ کی وجہ سے ۲-۵ سے جیتا۔ دوسرا گیم بھی دشوار ثابت نہیں ہوا۔ لاس اینجلس میں ہونے والا تیسرا گیم ڈرائزڈیل کی کلاسیکل کارکردگی سے عبارت تھا۔ اس گیم کی نو میں سے چھ اننگز میں نیویارک یانکیز کے تین سے زیادہ بیٹرز کے میدان میں اترنے کی نوبت نہیں آئی۔

چوتھا گیم بہت سخت ثابت ہوا۔ میں نے وہ گیم ٹی وی پر دیکھا تھا اور سچ یہ ہے کہ میرا بھی پسینہ چھوٹ گیا تھا۔ بہر حال ڈوجرز نے سٹریٹ گیمز میں سیریز جیت لی۔ نیویارک کلب کا یہ حشر پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک ایسا واقعہ تھا جو ۶۳ء میں امریکہ میں موجود ہوتے ہوئے میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اس واقعے کو بھولنے کی نسبت اپنا نام بھول جانا زیادہ آسان تھا۔

میرے اصرار پر فرینک نے ہماری پوری رقم ایک لاکھ بائیس ہزار ڈالر چھ شہروں کے ۲۳ مختلف بکیوں کے ذریعے اور لاس ویگاس، رینو اور سان جوآن کے جوئے خانوں میں پھیلا دی تھی۔ مجموعی طور پر ہم نے بارہ ملین ڈالر سے زیادہ رقم جیتی .... ایک کروڑ بیس لاکھ ڈالر!

☆==========☆==========☆

میں اور فرینک .... ہم دونوں جانتے تھے کہ شرطوں کا دور ختم ہوا۔ ہماری شہرت یا اسے بدنامی کہئے دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ پورے امریکہ میں کوئی کیسینو، کوئی بکی ایسا نہیں تھا جو تگڑی رقم کی ہماری شرط قبول کرتا۔

لیکن دولت کمانے کے اور بھی طریقے تھے .... اور وہ بھی شریفانہ!

".......... یہ اکاؤنٹ سیکشن ہو گا اور اس ہال میں لیگل سٹاف بیٹھے گا اور اس طرف.........."

فرینک سیگرام بلڈنگ کی پچاسویں منزل پر مجھے ہمارا آفس دکھاتے ہوئے بہت خوش تھا۔ آفس ابھی پوری طرح فرنشڈ نہیں تھا۔ جگہ کا انتخاب فرینک نے ہی کیا تھا۔ سب کچھ اس نے ہی کیا تھا۔ ہماری فرم کا نام فیوچر اِن کارپوریٹڈ تھا۔ فرینک نے سٹاف کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔

".......... یہ استقبالیہ ہے اور یہاں اس میز پر .... اندازہ لگاؤ کہ دو ہفتے بعد یہاں کون بیٹھے گا۔" فرینک کہہ رہا تھا۔

وہ بہت شاندار آفس تھا۔ مرعوب کر دینے والا۔ بیضوی ساخت کی بہت بڑی میز کے عقب میں سیاہ بارسلونا چیئر رکھی تھی۔ سامنے خوبصورت کیبنٹ میں ٹی وی سٹیریو رکھا تھا۔ دو دیواروں میں کھڑکیاں تھیں۔ ایک سے دریائے ہڈسن اور دوسری سے مین ہٹن کا نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ ایک دیوار پر بہت خوبصورت فریم میں ایک گھوڑے کی تصویر آویزاں تھی۔ وہ چیئیوگے تھا۔ کینٹکی ڈربی کا ونر۔ فریم پر پھولوں کا ہار چڑھایا گیا تھا۔

"یہ سب تمہارا ہے دوست۔" فرینک سے اپنی خوشی چھپائی نہیں جا رہی تھی۔

اس کی محبت اور خلوص نے میرے دل کو چھو لیا۔ "فرینک .... بہت شاندار ہے یہ۔"

"کوئی چیز ناپسند ہو تو بتا دو۔ میں فوراً بدلوا دوں گا۔"

"سب کچھ بہت اچھا ہے۔ تم نے حیران کر دیا ہے مجھے اور یہ چیئیوگے کی تصویر.........."

"میں نے سوچا، تمہیں یقیناً پسند آئے گی۔ یہی تو نقطۂ آغاز تھا نا۔"

"بے شک۔ یہ مجھے بہت کچھ یاد دلاتی رہے گی۔"

"یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا ہے کہ کبھی کبھی تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ حقیقت ہے۔ خواب سا لگتا ہے۔" اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ اس کے انداز میں ایک لمحے کو لڑکپن سا جھلکا تھا۔ مگر فوراً معدوم بھی ہو گیا تھا۔ اس پورے تجربے نے اسے بدل

ڈالا تھا۔ وہ اپنی عمر سے بڑا ہو گیا تھا۔

"تم نے زبردست کام کیا ہے پارٹنر۔" میں نے اسے داد دی۔

وہ چلا گیا۔ میں اپنی بارسلونا چیئر پر جا بیٹھا۔ اتنی جلدی اتنا سب کچھ ہو جانا خود میرے لئے بھی حیران کن تھا۔ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا اس کی تو مجھے بھی توقع نہیں تھی اور اب میں اتنا مضبوط تھا کہ سب کچھ بہت آسانی سے کر سکتا تھا۔ میرے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔

میں نے شیئر مارکیٹ کی قیمتوں کا اپنی مستقبل کی نالج کی روشنی میں جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ مجھے سال بہ سال کے معاشی اتار چڑھاؤ تو یاد نہیں تھے لیکن ایک عام سا اندازہ بہرحال تھا۔ اس سے بھی میں بہت اچھی طرح کام چلا سکتا تھا۔ کچھ سرمایہ کاریاں یقینی تھیں۔ مثلاً آئی بی ایم، زیروکس اور پولورائیڈ۔ اس کے علاوہ مجھے معاشرتی تبدیلیوں کا جائزہ لینا تھا۔ ان سے مجھے کلیو ملتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ فیوچر اِن کارپوریٹڈ ہوٹلوں اور ائرلائنز کے سٹاک بھاری تعداد میں خریدے گی۔ بوئنگ ائر کرافٹ میں سرمایہ لگانا بھی ضروری تھا۔ ابھی بوئنگ ۷۲۷ اور ۷۴۷ ایجاد نہیں ہوئے تھے لیکن اگلے تیس برسوں میں انہیں کمرشل ائرلائنز پر چھا جانا تھا۔ ابھی جاپانی کاروں کا مارکیٹ پر چھا جانا بہت دور کی بات تھی لہٰذا مختصر مدت کے لئے کرائسلر، جی ایم اور فورڈ کاروں میں ملین ڈالر کی سرمایہ کاری میں کوئی حرج نہیں تھا۔

مَیں نے آنکھیں موند لیں۔ یہ سب کچھ سوچ کر مجھے چکر آنے لگے تھے۔ پچھلی زندگی کی مالی پریشانیاں اب خواب و خیال ہو گئی تھیں۔ اب تو میں جوان تھا۔ دولت کی مجھے کوئی کمی نہیں تھی اور میں زندگی پرانے انداز میں گزارنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ مجھے تو اپنے تمام ارمان پورے کرنے تھے۔

☆==========☆==========☆

صدر جان ایف کینیڈی میرا ہیرو تھا!

مجھے یاد تھا کہ جب کینیڈی کو ڈلاس میں قتل کیا گیا تو مجھے کتنا دکھ ہوا تھا۔ وہ امریکہ کے مقبول ترین صدور میں تھا۔ شاید وہ زندہ رہتا تو امریکہ کا .... بلکہ ممکنہ طور پر دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ وہ نسلی تعصب اور کالوں گوروں کی دشمنی کو ختم کرنے کے لئے

قابلِ قدر کام کر رہا تھا۔ وہ ہوتا تو شاید ویت نام کی جنگ بھی پہلے ہی ختم ہو جاتی۔

اور اب .... اب جان کینیڈی کی زندگی بس تین ہفتے کی رہ گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں کسی طور اسے بچا سکتا ہوں لیکن وہ زندگی تھی۔ ٹی وی کا کوئی ڈرامہ نہیں تھا۔ نہ ہی وہ کسی سائنس فکشن کا پلاٹ تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں اس معاملے میں کامیاب مداخلت کر سکتا ہوں یا نہیں۔

میں نے سوچا، اس قتل کو روکنے کے لئے کچھ نہ کچھ کیا جا سکتا ہے۔ بس میں ایک کام نہیں کر سکتا تھا .... قاتل کا سامنا! پھر میں کیا کروں۔ ایف بی آئی کو فون کر دوں؟ سیکرٹ سروس کو خط لکھ دوں؟ لیکن نہیں، میں جانتا تھا کہ حکام اسے سنجیدگی سے نہیں لیں گے اور اگر ایسا ہوا بھی تو امکان یہی ہے کہ وہ الٹا مجھے ہی گرفتار لیں گے۔

میں اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ کسی سے اس سلسلے میں بات کروں گا تو وہ مجھے پاگل ہی سمجھے گا۔ البتہ بعد میں مجھ پر بھی شک کیا جا سکتا ہے۔ تو کیا کیا جائے؟ خاموش بیٹھ کر تماشا دیکھا جائے؟ نہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے؟

میں ۱۵ تاریخ کو ڈلاس چلا گیا۔ ائرپورٹ کے ایک فون بوتھ میں ٹیلی فون ڈائریکٹری سے میں نے لی ہاروے اوسوالڈ کا فون نمبر اور پتہ نوٹ کیا .... ۱۰۲۶ این بیکلے۔ فون نمبر۴۸۲۱-۵۵۵ پھر میں نے کرائے کی کار لی۔ کاؤنٹر پر موجود لڑکی نے مجھے مطلوبہ علاقے کے بارے میں تفصیل سے سمجھایا۔

میں چھ مرتبہ اوسوالڈ کے مکان کے سامنے سے گزرا۔ میں نے تصور میں خود کو اس کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر اطلاعی گھنٹی کا بٹن دباتے دیکھا۔ دروازہ یقیناً دھیمی آواز والی روسی عورت مرینا کھولتی۔ سوال یہ تھا کہ میں اس سے کیا کہوں گا۔ یہ کہ تمہارا شوہر صدر کینیڈی کو قتل کرنے والا ہے۔ اسے کسی طرح روکو اور اگر قاتل خود دروازے پر آ گیا تو؟ اس صورت میں کیا کروں گا میں؟ میں ایک بار پھر مکان کے سامنے سے گزرا۔ اس شخص کے بارے میں سوچتا ہوا، جو اس مکان میں رہتا تھا۔ جو ایک ہفتے بعد اپنے ایک فعل سے پوری دنیا پر اثرانداز ہونے والا تھا۔

میں رکے بغیر اس رہائشی علاقے سے نکل آیا۔ فورٹ ورتھ کی ایک مارکیٹ سے میں نے ایک سستا سا ٹائپ رائٹر، ٹائپنگ پیپر اور گلووز خریدے۔ پھر میں ہالی ڈے اِن کے

اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میں نے دستانے پہنے، کاغذ ٹائپ رائٹر پر چڑھایا اور خط تیار کرنے لگا۔ بنام صدر جان ایف کینیڈی۔ دی وائٹ ہاؤس ۱۶۰۰، پنسلوانیا ایونیو۔ واشنگٹن ڈی سی۔

”مسٹر کینیڈی۔ تم وہ شخص ہو جس نے کیوبا کے عوام اور پریمیر فیڈل کاسترو کو دنیا میں تنہا کر دیا ہے۔ تم لاطینی امریکہ میں بلکہ پوری دنیا میں آزاد انسانوں کے سب سے بڑے دشمن ہو۔ یاد رکھو، اگر تم ڈلاس آئے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ میں طاقتور رائفل سے تمہارا بھیجا اُڑا دوں گا۔ یہ مغربی نصف کرے کے حریت پسندوں کے ساتھ انصاف ہو گا۔ یہ خالی خولی دھمکی نہیں۔ میں مسلح بھی ہوں اور مجھے موت کا ڈر بھی نہیں۔ لی ہاروے اوسوالڈ۔“

میں نے اوسوالڈ کے گھر کا مکمل پتہ بھی لکھا تھا۔ پھر میں کمرے سے نکل آیا۔ اوسوالڈ کے گھر کے قریب پوسٹ آفس سے میں نے وہ خط پوسٹ کیا۔ پھر ڈلاس سے چالیس میل دور ایک جھیل میں ٹائپ رائٹر کو پھینک دیا۔ دستانوں سے جان چھڑاتے ہوئے مجھے طمانیت کا احساس ہوا۔ میں ہالی ڈے اِن واپس آ گیا۔

اگلے چار دن میں ہالی ڈے اِن میں اپنے کمرے میں رہا۔ روم سروس والوں کے سوا کسی سے میری بات نہیں ہوئی۔ میں صرف اخبار لانے کے لئے باہر نکلتا تھا۔ منگل ۱۹ تاریخ کے ڈلاس ہیرالڈ میں آخرکار وہ خبر چھپ گئی جس کا مجھے انتظار تھا۔ لی ہاروے اوسوالڈ کو سیکرٹ سروس والوں نے گرفتار کر لیا تھا۔ کینیڈی کا ٹیکساس کا دورہ مکمل ہونے تک اسے ان کی تحویل میں رہنا تھا۔

نیویارک واپس جاتے ہوئے میں مطمئن تھا۔ میں نے انسانیت کے مستقبل کی بہتری کے لئے ایک اہم قدم اٹھایا تھا۔ کینیڈی دنیا سے بے انصافی اور نسلی تعصب کا خاتمہ کرنے کا عزم رکھتا تھا۔

☆==========☆==========☆

جمعے کی دوپہر ایک بج کر دس منٹ پر میری سیکرٹری نے بغیر دستک کے دروازہ کھولا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اس سے پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے جان لیا کہ کیا ہو گیا ہے اور مجھے بہت بڑا دھچکا لگا تھا۔ پیچھے سے فرینک آیا۔ اس نے لڑکی کو بتایا کہ آج بزنس نہیں ہو گا۔ تمام سٹاف کو

چھٹی دے دی جائے۔ پھر میں اور فرینک بلڈنگ سے نکل آئے۔ پارک ایونیو کے قریب لوگ بہت بڑی تعداد میں جمع تھے۔ کچھ تو آنسوؤں سے رو رہے تھے۔ کچھ خالی خالی نظروں سے سامنے دیکھ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ سب ہل گئے ہیں۔ کسی سے زمین پر قدم جمایا نہیں جا رہا تھا۔ سب کے دل و دماغ جیسے شل تھے۔

ہم دونوں میڈیسن کے ایک بار میں جا بیٹھے۔ ٹی وی سکرین پر ڈلاس ائرپورٹ سے ائرفورس ون مقتول صدر کی لاش لے کر ٹیک آف کرتا نظر آ رہا تھا۔ پھر جانسن کی حلف برداری کی تقریب دکھائی جانے لگی۔ جیکولین کینیڈی سناٹے کی سی کیفیت میں اس کے ساتھ کھڑی تھی۔

"یہ بتاؤ، اب کیا ہو گا؟" فرینک نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

میں بری طرح چونکا۔ "میرا خیال ہے، اب سب کچھ اس پر منحصر ہے کہ جانسن کیسا صدر ثابت ہوتا ہے۔"

"خیال نہیں، اندازہ نہیں۔ میں دیکھ چکا ہوں کہ تم اندازے نہیں لگاتے۔ تم جانتے ہو کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔" فرینک نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں، تم کہاں کی ہانک رہے ہو۔"

"مجھے بھی نہیں پتہ۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ تمہارے اندر کوئی چیز عجیب سی ہے اور وہ جو کچھ بھی ہے، مجھے اچھی نہیں لگتی۔" فرینک کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

"فرینک .... یہ دن ہی اچھا نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم سبھی شاک میں ہیں۔"

"نہیں۔ تمہیں کوئی شاک نہیں .... کم از کم میری اور دوسرے لوگوں کی طرح ہرگز نہیں۔ تمہیں ہم میں سے کسی نے نہیں بتایا کہ کیا ہوا ہے لیکن تمہیں معلوم تھا۔"

"کیسی احمقانہ بات کر رہے ہو۔" میں گڑبڑا گیا۔

"یہ بتاؤ، تم ڈلاس کیوں گئے تھے پچھلے ہفتے؟"

میں نے اسے بغور دیکھا۔ "کچھ پراپرٹی دیکھنے گیا تھا میں۔ ٹیکساس ایک بڑھتی پھیلتی ہوئی مارکیٹ ہے۔ آج کے واقعے کے باوجود۔"

"میرا خیال ہے، اس واقعے کے بعد صورتِ حال بدل جائے گی۔"

"نہیں بدلے گی۔"

"کیوں؟"

"میری چھٹی حس بتاتی ہے۔"

"تمہاری چھٹی حس نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔" فرینک نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ابھی ہم اور آگے جائیں گے۔"

"ہم نہیں، میں کہو۔ کیونکہ میں اور آگے نہیں جانا چاہتا۔"

"بھائی .... ابھی تو ہم نے سٹارٹ بھی نہیں لیا ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں بہت آگے جانا ہے لیکن اب میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔"

"کیا بات کر رہے ہو۔ کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ کینیڈی کے قتل سے.........."

فرینک نے ہاتھ اٹھا کر مجھے کچھ کہنے سے روک دیا۔ "میں نے یہ نہیں کہا اور میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔ میں بس تم سے تعلق توڑ رہا ہوں۔ میرے حصے کا سرمایہ تم منافع میں سے تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کر دو۔ میرا کام تم جم اسپنسر کے سپرد کر دو۔ وہ اچھا آدمی ہے اور سمجھدار بھی ہے۔ تمہاری ہدایات کے مطابق کام کرے گا۔ حرف بہ حرف۔"

"لیکن ہم ہر مرحلے میں ساتھ رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا.........."

"یہ ٹھیک ہے لیکن میں اب اس چکر سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ میں اب قانون کی تعلیم مکمل کروں گا۔ اتنا کچھ ہے میرے پاس کہ زندگی عیش سے گزر سکتی ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ "گڈ لک آفاق......... اور شکریہ۔ تمہارے ساتھ بہت پُرلطف وقت گزرا ہے۔"

وہ چلا گیا۔ میں بار میں بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد ٹی وی پر خصوصی بلیٹن کے ذریعے بتایا گیا کہ ڈلاس پولیس نے ایک مشکوک شخص کو گرفتار کیا ہے۔ وہ فوجی بھگوڑا ہے اور بائیں بازو سے تعلق رکھتا ہے، اس کا نام نیلسن بینٹ ہے۔ اس کی جیب میں سے پولیس کو ایک کاغذ پر لکھا میکسیکو سٹی میں روسی سفارت خانے کا فون نمبر بھی ملا ہے۔

میں مسلسل نیلسن بینٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ بینٹ کون تھا۔ کہاں سے آ ٹپکا تھا۔ کیا کینیڈی کو قتل کرنے کے لئے کئی افراد کو مختلف درجہ بندیوں کے ساتھ مامور کیا گیا تھا؟ یا اوسوالڈ اصل قاتل تھا ہی نہیں اور سازش بہت زیادہ گہری تھی؟ بہر حال مجھے معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ میں بے اختیار نہیں ہوں۔ میں نے اپنی، فرینک کی اور شرلا کی قسمت بدل ڈالی تھی۔ شاید اسی لئے کہ ہم تاریخی اہمیت کے حامل انسان نہیں تھے۔ ہاں میں دنیا کی تاریخ نہیں بدل سکا تھا۔ کینیڈی بچ جاتا تو دنیا میں بڑی تبدیلیاں رُونما ہوتیں۔ دنیا کا وہ نقشہ نہ رہتا جو میں نے ۹۳ء تک دیکھا تھا یا شاید میری ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ میرے پاس اندر کی معلومات نہیں تھیں۔ میں ۶۳ء کے بعد کی دنیا کے بارے میں وہی کچھ جانتا تھا جو الیکٹرونک میڈیا سے نشر ہوا تھا یا اخبارات و رسائل میں شائع ہوا تھا۔ میں نے تاریخ کا دھارا موڑنے کی کوشش کی تھی مگر ہوا کیا؟ یہی کہ ایک قاتل کا نام بدل گیا بس؟

میں نے سوچا، چلو یہی کیا کم ہے کہ میں اپنی زندگی بدل سکتا ہوں۔ زندگی کی سچی خوشیاں حاصل کر سکتا ہوں۔

"ایفاک .... اومائی گاڈ۔ جلدی سے یہاں آؤ۔" شرلا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "بینٹ کو قتل کر دیا گیا۔ ابھی میں نے ٹی وی پر دیکھا ہے۔"

میں تیزی سے کمرے کی طرف لپکا۔ ٹی وی پر بینٹ کے قتل کا منظر بار بار دکھایا جا رہا تھا۔ قاتل وہی تھا .... جیک روبی .... اور مقام بھی وہی تھا .... ڈلاس کاؤنٹی جیل کا بیسمنٹ کاریڈور! آگے کا حال میں بتا سکتا تھا۔ عنقریب صدر جانسن اس خونی ویک

اینڈ پر پیش آنے والے واقعات کی تحقیقات کے لئے چیف جسٹس ارل وارن کی قیادت میں ایک خصوصی کمیشن قائم کریں گے۔ بہت سے سوالوں کے جواب تلاش کئے جائیں گے لیکن کوئی جواب نہیں ملے گا .... اور زندگی جاری رہے گی۔

☆==========☆==========☆

اس کے بعد میرا ایک ہی کام رہ گیا .... دولت بنانا! اور میں اس فن میں طاق ہو چکا تھا۔ فلموں سے مجھے خاصی دلچسپی رہی تھی۔ لہٰذا فلموں کے شیئرز کا انتخاب میرے لئے بہت ہی آسان تھا۔ برج آف دی ریور کوائی اور قلوپطرہ وہ ابتدائی فلمیں تھیں جن کا بزنس کئی ملین ڈالر تھا۔ میری دولت میں اضافہ بہت تیزی سے ہوتا رہا۔

پھر ایک اہم دن آیا .... کاسیئس کلے اور سونی لسٹن کی ہیوی ویٹ ٹائٹل فائٹ کا دن۔ میں شرلا کے ساتھ فائٹ دیکھنے گیا۔ میں نے شرلا کو کلے پر شرط لگانے کا مشورہ دیا تھا لیکن اس نے لسٹن پر شرط لگائی۔ وہاں بہت سارے بکیوں نے مجھے پہچان لیا۔ ورلڈ سیریز بیس، بال پر شرط جیتنے پر مجھے شہرت ہی ایسی ملی تھی بلکہ بدنامی کہئے۔ یہی نہیں، بڑی شرطیں لگانے والوں نے بھی مجھے دیکھ کر خیر مقدمی انداز میں ہاتھ لہرائے۔ میں ان کی برادری سے خارج ہو چکا تھا مگر ان کے لئے بے حد محترم تھا۔ درحقیقت میں ان کے لئے دیومالائی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ میرے لئے یہ بات پریشان کن تھی۔ جواریوں میں مقبولیت کون پسند کرتا ہے جبکہ اب میں معززین میں شمار ہوتا تھا۔

درحقیقت میں اب شرلا کو بھی اپنے معزز ہونے کی راہ میں رکاوٹ تصور کرنے لگا تھا۔ اس کا چمکیلا، بھڑکیلا لباس، اس کا میک اپ، اس کی چال ڈھال، اس کے طور طریقے عامیانہ تھے۔ اس میں وقار نہیں تھا۔ لہٰذا میں اس سے اکتا گیا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ رہتے ایک سال ہو گیا تھا۔ وہ ہر چیز میں میری شریک رہی تھی سوائے میرے ذہن اور جذبات کے۔ اس کے پاس سوائے حسن کے کچھ بھی نہیں تھا۔ اب میں سوچتا تھا کہ میں نے اس تعلق کو اتنے دن کیوں چلنے دیا۔

اس روز وہ شاپنگ کر کے واپس آئی تو میں وہ بھاری براؤن لفافہ لئے اس کا منتظر بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے لبھانے کی کوشش کی مگر میرے جذبات سرد پڑ چکے تھے۔ میں نے لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے لفافے کو کھولا اور سو ڈالر کے نوٹوں کی چھ موٹی ڈھیریوں کو خاصی دیر تک دیکھتی رہی۔ "یہ کتنی رقم ہے؟" آخرکار اس نے پوچھا۔

"دو لاکھ!" میں نے جواب دیا۔

اس نے لفافے میں سے ائرلائن کا ٹکٹ نکال کر دیکھا۔ "ریو کا ٹکٹ؟ اور کل کی فلائٹ؟" وہ بڑبڑائی۔ "مگر میرا تو سامان نیویارک میں ہے۔"

"وہ تم جہاں کہو گی، میں بھجوا دوں گا۔"

"اور مجھے کچھ خریداری بھی کرنی ہے۔"

اب وہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ذبح کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر میرے لئے دولت کی اہمیت کچھ بھی نہیں تھی۔ "جو چاہو خرید لو۔ بل میرے ہوٹل کے کمرے میں بھجوا دو۔" میں نے جواب دیا۔

☆==========☆==========☆

۶۸ء تک میری کمپنی کے اثاثوں کی مالیت سینکڑوں ملین ڈالرز تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے پارک ایونیو اور ففٹی تھرڈ پر فیوچر اِن کارپوریٹڈ کی ۶۰ منزلہ عمارت کی تعمیر شروع کرا دی تھی۔ فرینک کا سرمایہ میں نے منافع کے ساتھ واپس کر دیا تھا۔ چیک کے ساتھ میں نے اسے خط بھی بھجوایا تھا لیکن مجھے کبھی جواب نہیں ملا۔

اس کے بعد میں نے زمین میں دلچسپی لینی شروع کی۔ ہیوسٹن، ڈینور، اٹلانٹا اور لاس اینجلس میں رہائشی اور تجارتی علاقوں میں، میں نے بے تحاشا زمین خریدی۔ لاس اینجلس میں، میں نے نیو سینچری سٹی پروجیکٹ کے قریب ایک زمین کوڑیوں کے مول خریدی۔ یعنی پانچ ڈالر فی مربع فٹ۔ مجھے معلوم تھا کہ جلد ہی اس کی قیمت کہیں کی کہیں پہنچ جائے گی۔ اپنے ذاتی استعمال کے لئے میں نے ڈچز کاؤنٹی میں تین سو ایکڑ زمین خریدی۔

گھر والوں سے میرا رابطہ تھا۔ انہیں میں نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ ابو ابتدا میں بہت ناراض ہوئے تھے مگر چار و ناچار انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اب بھی فون پر ان سے بات ہوتی رہتی تھی۔ ۶۸ء میں، میں نے انہیں فون پر مشورہ دیا کہ وہ اپنی انڈسٹری فروخت کر دیں۔ وہ اس کام کے لئے مناسب ترین وقت تھا۔ پاکستان میں صنعتیں اس وقت اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھیں کوئی نہیں جانتا تھا کہ اگلے سال سے سخت وقت

شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد تو لوگ سرمایہ لگاتے ہوئے ڈرا کریں گے۔

میری توقع کے عین مطابق ابو نے میرا مشورہ ٹھکرا دیا۔ میں نے انہیں بہت سمجھایا۔ خوشامد تک کی لیکن وہ نہ مانے۔ مجھے بھی زیادہ پرواہ نہیں تھی۔ میں خود مضبوط تھا لہٰذا آنے والے وقت کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ دولت کمانے میں لگا رہا۔ یہ میرے لئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔

۷۰ء آ گیا۔ میں اس سال کے ۲۴ جون کی راہ تکنے لگا۔ یہ میری زندگی کی اہم تاریخ تھی جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ جون کا مہینہ شروع ہوتے ہی میں نے جم سپنسر کو تفصیلی ہدایات دیں، کون سے شیئرز خریدنے ہیں، کون سے فروخت کرنے ہیں .... کیا کرنا ہے۔ ظاہر ہے، مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری واپسی کب ہو گی۔ جم سپنسر قابلِ اعتبار آدمی تھا اور ہدایات پر پوری طرح عمل کرنے کی اہمیت سے بھی واقف تھا۔ چنانچہ ۱۵ جون کو میں پاکستان روانہ ہو گیا۔

ابو امی اور کوثر مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ میں ہمیشہ کے لئے واپس آ گیا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ واپس تو جانا ہے۔ مسئلہ میرے کاروبار کا ہے۔ ابو بولے .... یہاں بھی خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ بس اب یہیں رہو بلکہ وہاں کا کاروبار ختم ہی کر دو۔ میں ہنس کر چپ ہو گیا۔ نہ انہیں یہ بتا سکتا تھا کہ میرا کاروبار کتنا وسیع ہے اور نہ یہ سمجھا سکتا تھا کہ تین برس کے اندر اندر وہ قلاش ہو جائیں گے۔

میں نے پہنچتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ کراچی، اسلام آباد فلائٹ پر سیٹ ریزرو کرا لی تھی۔ ۲۴ جون کو میں بن ٹھن کر، سج دھج کر ائرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میری توقع پوری ہو گئی۔ بلقیس میرے برابر والی سیٹ پر موجود تھی .... پچھلی زندگی کی طرح۔ اس کے ہاتھ میں آرتھر ہیلے کا ناول ائرپورٹ تھا۔ ہارڈ کور ایڈیشن۔

ائر ہوسٹس نے ہمیں کافی لا کر دی۔ بلقیس نے ناول بند کرتے ہوئے سرسری انداز میں مجھے دیکھا۔ "یہ ناول بہت دلچسپ ہے نا؟" میں نے آغازِ کلام کیا۔

اس نے مجھے ناقدانہ نظروں سے دیکھا اور بولی۔ "دلچسپ ہے لیکن میرے خیال میں فلم زبردست بنے گی اس پر۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا .... فلم نہیں فلمیں کہو۔ ہمارے درمیان فلموں

کے موضوع پر بات ہونے لگی۔ "میرا نام آفاق عباسی ہے۔" میں نے کہا "اور آپ.........."

"میں بلقیس انور ہوں۔" وہ بولی۔

میں اسے بڑی چاہت سے دیکھتا رہا۔ وہ بائیس سال میری بیوی رہی تھی۔ اسے ایک بار پھر تر و تازہ، خوبصورت اور نوجوان دیکھنا میرے لئے بے حد خوشگوار تھا۔ مگر مَیں نے محسوس کیا کہ میری نظریں اسے اچھی نہیں لگی ہیں۔ اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔

"آپ اسلام آباد کیوں جا رہی ہیں؟" مَیں نے پوچھا۔

"میرے والد ہوم منسٹری میں ہیں۔ ان سے ملنے جا رہی ہوں۔ مَیں کراچی یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں۔ تعلیم مکمل ہونے تک والدین سے دوری ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور آپ؟"

"میں بھی والدین سے ملنے کے لئے امریکہ سے آیا ہوں۔ اسلام آباد ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔"

"تو آپ امریکہ میں پڑھتے ہیں؟"

"نہیں، ایموری میں پڑھتا رہا ہوں۔" مَیں نے کہا۔ میرے کانوں میں ماضی کی آواز گونجنے لگی۔ "آفاق، تمہیں ذرا بھی احساس نہیں کہ .... تمہیں بالکل پرواہ نہیں کہ ...." میں نے سوچا، اب یہ جملہ کبھی نہیں سنوں گا مَیں۔ تمہاری ہر محرومی کی تلافی کر دوں گا۔ مَیں نے کہا۔ "اب تو میرا اپنا کاروبار ہے وہاں۔ بہت بڑا۔ نیویارک میں رہتا ہوں۔"

"کیسا کاروبار؟"

"سرمایہ کاری۔"

"یعنی سٹاک بروکر ہیں آپ؟"

"نہیں، میری اپنی کمپنی ہے۔ بروکرز سے تو مَیں کام لیتا ہوں۔ مَیں سٹاکس میں، جائیداد میں اور مستقبل میں بہت زیادہ پھلنے پھولنے والی کمپنیوں میں دلچسپی لیتا ہوں۔"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ مَیں ان خوبصورت آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ میں اس

بار تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ مَیں نے دل ہی دل میں کہا۔ "وہ پوری کمپنی آپ کی ہے؟" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"جی ہاں۔ چند برس پہلے ایک پارٹنر تھا میرا، مگر اب پوری کمپنی میری ہے۔"

"آپ کو وراثت میں ملی ہو گی وہ کمپنی۔ میرا مطلب ہے کہ نیویارک میں اتنا بڑا کاروبار۔ اتنی بڑی کمپنی میں تو کسی پاکستانی کو جاب بھی آسانی سے نہیں ملے گی۔"

"نہیں مس بلقیس۔ وہ کمپنی میری اپنی ہے۔ مَیں نے بمشکل ڈھائی ہزار ڈالر سے کام شروع کیا تھا۔ پہلے مَیں نے گھڑ دوڑ اور بیس بال پر کچھ شرطیں جیتیں اور اب اللہ کا فضل ہے۔"

اب وہ مجھے تمسخرانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "عمر کتنی ہے آپ کی؟"

"۲۳ سال۔" مَیں نے کہا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میں ضرورت سے زیادہ بولتا رہا ہوں۔ وہ مجھے کوئی شیخی خورا سمجھ رہی تھی جو اسے لبھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟"

"نفسیات میں آنرز کر رہی ہوں۔" اس نے کہا لیکن گفتگو کا رخ نہیں بدلنے دیا "آپ کا دفتر کہاں ہے نیویارک میں؟"

"پوری بلڈنگ ہے میری۔ پارک ایونیو اور ففٹی تھرڈ پر۔ آپ کبھی امریکہ گئی ہیں؟"

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ "پارک ایونیو پر آپ کی اپنی بلڈنگ۔ بہت خوب!" اب وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے ناول دوبارہ کھول لیا اور پڑھنے لگی۔

"سنیں، آپ سمجھ رہی ہیں کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ یقین کیجئے.........."

"چھوڑیں۔ مجھے کیا۔ مجھے یقین دلانے کی.........."

"ضرورت ہے۔" مَیں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مَیں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ میری کمپنی کا نام فیوچر اِن کارپوریٹڈ ہے۔ ساٹھ منزلہ عمارت ہے اس کی.........."

"میں نے کہا نا، مجھے کیا.........."

"دیکھیں.......... میرے اور آپ کے درمیان بہت کچھ مشترک ہے۔ وہ جو کبھی کسی کو دیکھ کر برسوں کی شناسائی کا احساس ہوتا ہے نا.......... جیسے کبھی ہم پچھلی زندگی میں

مل چکے ہوں............"

"خرافات............ بکواس یہ جاہل ہندوؤں والا عقیدہ تو اب ہندوؤں نے بھی مسترد کر دیا ہے۔" وہ تپ گئی۔ "اور مجھے اپنے اور آپ کے درمیان کچھ مشترک نہیں محسوس ہوتا۔ اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو۔"

اسی وقت اناؤنسمنٹ ہو گیا کہ مسافر سیٹ بیلٹس کس لیں، جہاز لینڈ کرنے والا ہے۔

ائرپورٹ پر مَیں نے بلقیس کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔

☆==========☆==========☆

"ہیلو!"

"بلقیس، مَیں آفاق عباسی بول رہا ہوں۔ یاد ہے نا! ہم اسلام آباد کی فلائٹ پر ملے تھے۔"

"تمہیں میرا فون نمبر کیسے معلوم ہو گیا؟"

میں نے دل میں کہا۔ "تمہارے متعلق کون سی ایسی بات ہے جو میرے علم میں نہیں۔" میں جانتا تھا کہ کراچی میں وہ اپنی بیوہ پھوپھی کے ساتھ رہتی ہے۔ میں نے کہا۔

"اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ مجھے تمہارا فون نمبر کہاں سے مل گیا۔ مَیں نے تمہیں بزنس ویک کے چند تازہ شمارے پوسٹ کئے ہیں۔ اس میں میرے متعلق کئی آرٹیکل چھپے ہیں۔ ان سے میری ہر بات کی تصدیق ہو جائے گی۔"

"تم مجھے کوئی نفسیاتی مریض معلوم ہوتے ہو۔" اس نے بھنا کر کہا۔ "تم جھوٹے ہو یا سچے، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم دنیا کے سب سے دولت مند آدمی بھی ہو تو مجھے کیا۔"

"میری بات تو سنو۔"

"تم غور سے سنو۔ میرے پاپا بڑے بارسوخ آدمی ہیں۔ اب اگر تم نے مجھے فون کیا یا خط لکھا تو پولیس ہی تمہارا دماغ درست کرے گی۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

مَیں پورے ایک سال اس کے پیچھے پڑا رہا لیکن لاحاصل۔ پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ

پہلا تاثر آخری تاثر والی بات کتنی درست ہے۔ آخرکار میں دل شکستہ نیویارک واپس آ گیا۔

زندگی پھر اپنے اسی ڈھرے پر گھومنے لگی۔ دولت .... دولت .... اور دولت............! ۷۱ء میں پاکستان دولخت ہوا۔ ۷۲ء میں پاکستان میں عوامی حکومت قائم ہوئی جسے ۷۷ء میں عوام ہی کے ہاتھوں ختم ہو جانا تھا۔ عوامی حکومت نے صنعتوں کو قومیا لیا۔ ۷۳ء میں، میں پاکستان گیا۔ مَیں نے کوثر کی شادی کرائی اور امی ابو کو اپنے ساتھ لے آیا۔ حالانکہ وہ دونوں اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ ابو نے امریکہ میں میرے کاروبار کا پھیلاؤ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اب وہ مجھے ستائشی نظروں سے دیکھتے تھے۔

شادی زندگی کی ایک اہم ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص کو اس کی محبت نہ ملے اور اس کے پاس دولت ہو تو وہ کیا کرے گا؟ شادی .... لیکن انسان سے انسان کی نہیں، دولت سے دولت کی شادی۔ سو میں نے بھی ڈیانا سے شادی کر لی۔ ڈیانا کا تعلق بوسٹن سے تھا۔ وہ ملک کی قدیم ترین اور سب سے بڑی انشورنس کمپنیوں میں سے ایک کی وارث تھی۔ خوبصورت بھی تھی اور مہذب بھی۔

شادی کے ایک سال بعد میرے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ مَیں نے اس کا نام حنا رکھا تاکہ ڈیانا بھی اسے حنا کہہ کر خوش ہو جایا کرے۔ ابو اور امی کی تو عید ہو گئی۔ دونوں حنا کے پروانے بن گئے۔ ڈیانا کو یہ بات بہت بری لگتی تھی لیکن ایک تو مَیں مالی اعتبار سے کمزور نہیں .... بلکہ بہت طاقتور تھا۔ دوسرے ڈیانا مجھ سے محبت بہت کرتی تھی۔ مجھ سے علیحدگی اسے برداشت نہیں تھی لیکن حنا کی پیدائش کے بعد ہمارے درمیان اختلافِ رائے معمول بن گیا۔ ازدواجی زندگی اتنی خوشگوار نہیں رہی۔ بہرحال حنا کی تربیت دادا دادی کے ہاتھوں ہوتی رہی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی۔

پہلی بار مجھے پتہ چلا تھا کہ اولاد کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اتنی محبت بھی کی جا سکتی ہے۔ میں تو اب حنا کو دیکھ کر جیتا تھا۔ کاروباری مصروفیات تو تھیں ہی نہیں۔ دفتر صرف ایک گھنٹے کے لئے جانا بھی بہت تھا۔ دولت عمر بھر میرے لئے مسئلہ نہیں بن سکتی تھی۔ چنانچہ حنا کو دینے کے لئے میرے پاس وقت کی بالکل کمی نہیں تھی۔ مگر مجھے بلقیس بہت شدت سے یاد آتی تھی۔ میں سوچتا، کاش حنا میری اور بلقیس کی

بیٹی ہوتی۔

حنا ۷۹ء میں پیدا ہوئی تھی۔ میرے والدین کا انتقال ۸۸ء میں ہوا۔ ۸۸ء میں، میں ان کی طرف سے بہت پریشان رہا۔ میرا خیال تھا کہ اس سال وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں گے لیکن وہ مزید سات سال ہمارے ساتھ رہے۔ میں اس کی یہی توجیہہ کر سکتا ہوں کہ پچھلی زندگی میں سب کچھ چھن جانے کے صدمے اور مالی پریشانیوں نے انہیں وقت سے پہلے مار ڈالا تھا۔ اس اعتبار سے ان کی موت میرے لئے پہلے جتنا بڑا صدمہ نہیں تھی۔ مجھے ان کے مبارک سائے تلے سات سال بونس کے طور پر ملے تھے لیکن میری حنا کے لئے وہ بہت بڑا صدمہ تھا۔

حنا کو موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ ابو اور امی کے پاس جو پاکستانی موسیقی کے کیسٹ تھے وہ ان کی دیوانی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کہ میری بیٹی کی روح خالص مشرقی ہے۔ جبکہ ڈیانا اس بات سے چڑتی تھی۔ وہ تو اچھا تھا کہ ڈیانا کی سوشل مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ اس نے کبھی حنا کو زیادہ وقت نہیں دیا تھا مگر ابو اور امی کی وفات کے بعد صورتِ حال کبھی قابو سے باہر تو نہیں ہوئی لیکن میں بہرحال اعصابی مریض بنتا گیا۔ اب میں پچھتاتا تھا کہ میں نے امریکی عورت سے شادی کیوں کی۔

میری بہن کوثر پاکستان میں خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ دو تین سال میں ایک بار وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ مجھ سے ملنے ضرور آتی تھی۔ میری مدد اور تعاون سے میرے بہنوئی نے پاکستان میں اپنے کاروبار کو بہت مستحکم کر لیا تھا۔ وہ بڑا پُرخلوص آدمی تھا اور ہم لوگوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ ایک بار تو سکول کی چھٹیوں میں حنا بھی پاکستان ہو آئی تھی۔ ہو کیا آئی تھی، وہ تو وہیں رہنا چاہتی تھی لیکن ڈیانا کو یہ گوارا نہیں تھا۔ میں نے اصرار نہیں کیا کہ خواہ مخواہ زندگی کو جہنم بناتا۔ میں نے حنا کو سمجھا دیا تھا کہ سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد وہ اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے آزاد ہو گی۔ دادا دادی کی موت کے بعد حنا کا امریکہ میں دل نہیں لگتا تھا۔ میں نے اپنے طور پر اپنی وصیت کے ذریعے حنا کو مالی پریشانیوں سے ہمیشہ کے لئے بے نیاز کر دیا تھا۔

زندگی کسی پُرسکون دریا کے مانند بہے جا رہی تھی۔

☆==========☆==========☆

سکرین پر متحرک لکیریں بغیر کسی اتار چڑھاؤ کے پُرسکون نظر آ رہی تھیں!

"کہیں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

"مجھے تو آپ لفظوں میں بتائیں۔ میں یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتا۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

کارڈیولوجسٹ نے مشین کو آف کر دیا، جو میرے دل کا گراف سکرین پر پیش کر رہی تھی اور مسکرایا۔ "مطلب یہ ہے کہ آپ کا دل پرفیکٹ انداز میں کام کر رہا ہے۔ کوئی ۴۸ سالہ شخص اپنے دل سے اتنی اچھی کارکردگی کی توقع نہیں کر سکتا۔ ایکس رے اور دیگر ٹیسٹ ثابت کرتے ہیں کہ آپ کے پھیپھڑوں کی کارکردگی بھی غیر معمولی ہے۔"

"یعنی توقع کر سکتا ہوں کہ ابھی.........."

"آپ نے اپنی صحت کا اسی طرح خیال رکھا تو سو برس جینا بھی کوئی بڑی بات نہیں آپ کے لئے۔ آپ جمنازیم اب بھی جاتے ہیں؟"

"ہاں، ہفتے میں تین بار۔" میں نے جواب دیا۔

"بس آپ اسی طرح اپنا خیال رکھتے رہیں۔"

میں اس سے مزید چند منٹ باتیں کرتا رہا مگر میرا ذہن کہیں اور تھا۔ پچھلی زندگی میں؛ اسی عمر میں، میں موٹا اور بھدا ہو گیا تھا۔ مجھے وہ دن یاد تھا جب میرے سینے میں درد اٹھا تھا۔ ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور میں سینے پر ہاتھ رکھے اپنی میز پر گرتا گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس بار ایسا نہیں ہو گا۔ میں نے اس کے لئے جدوجہد کی تھی۔

☆==========☆==========☆

میں لاگرینول کے عقبی کمرے میں لنچ کو ترجیح دیتا لیکن ڈیانا کو ایسے موقعوں پر بھی یہ اچھا لگتا تھا کہ دوسرے اسے دیکھیں۔ لہٰذا ہم ریسٹورنٹ کے پُرہجوم اور پُرشور ڈائننگ ہال میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ میں ڈیانا کے سوگوار موڈ اور ساتھ کی دو میزوں پر ہونے والی گفتگو سے دھیان ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کھانے پر پوری توجہ دے رہا تھا۔ داہنی جانب والی میز پر ایک جوڑا بیٹھا شادی کے موضوع پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔ جبکہ بائیں میز پر بیٹھے جوڑے کا موضوع تھا طلاق اور میرے اور ڈیانا کے درمیان معاملہ ان دونوں کے بین بین تھا۔

"تو تم اسے سارہ لارنس میں داخل کرانا چاہتے ہو؟" ڈیانا نے کہا۔

"دیکھو، حنا اب تیرہ سال کی ہے اور سارہ لارنس والوں کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ کیا کرتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں گیارہ سال کی تھی تو کانکرڈ اکیڈمی میں تھی۔"

"اس لئے کہ تمہارے والدین کو تمہاری کوئی پرواہ نہیں تھی۔"

اس نے چھری کانٹا پلیٹ میں رکھ دیا اور گھور کر مجھے دیکھا۔ "میرے پلنے بڑھنے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں کہ میں کیسے پلی بڑھی..........."

"درست کہہ رہی ہو لیکن حنا کیسے پلتی بڑھتی ہے اس سے میرا تعلق ہے۔" میں نے بڑے سکون سے کہا۔

"اور اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اسے اچھی سے اچھی تعلیم دلاؤ.........."

"یہاں ہمارے نقطۂ نظر مختلف ہیں۔ تم جسے بہترین تعلیم سمجھتی ہو، میں نہیں سمجھتا۔ مجھے حنا کی آزادی عزیز ہے۔ میں اسے کتابوں کا کیڑا نہیں بنانا چاہتا اور پھر سارہ لارنس کا ماحول بہت اچھا ہے۔"

"کانکرڈ اکیڈمی کا ماحول اس سے بھی اچھا ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر یہ بات کہہ رہی ہوں۔"

میں جانتا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں اپنی بچی کو دولت کے بگاڑ دینے والے اثرات سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ میں اسے امریکی طرزِ معاشرت سے بچانا چاہتا تھا۔ میں اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کو جلا دینا چاہتا تھا۔ میں اس کے اندر کی مشرقی لڑکی کو توانا کرنا چاہتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا۔

"تم تو بس یہ چاہتے ہو کہ وہ پیانو بجاتی رہے۔ گیت گاتی رہے تمہارے وطن کے۔" ڈیانا نے کہا۔

"میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ فائن آرٹس کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ خیر..........اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔"

"ہمیں کانکرڈ اکیڈمی کو جمعرات تک مطلع کر دینا ہے۔"

"تو پھر بدھ کو بات ہو گی اس موضوع پر۔" میں نے فیصلہ سنایا۔ پھر میں نے جیلٹ

کی جیب سے جیلوسل کی دو ٹیبلٹس نکالیں اور پانی سے لے لیں۔ میرا دل کتنی ہی اچھی حالت میں کیوں نہ ہو، یہ زندگی جو میں نے اپنے لئے تخلیق کی تھی، خود میرے لئے عذاب بن گئی تھی۔

☆==========☆==========☆

حنا کی پتلی پتلی انگلیاں کی بورڈ پر بہت خوبصورتی سے رقص کر رہی تھیں۔ وہ دل دل پاکستان کی دھن بجا رہی تھی۔ اس کی بلی پیانو کے پاس بیٹھی تھی۔ لگتا تھا، بہت توجہ سے موسیقی سن رہی اور محظوظ ہو رہی ہے۔ میں اپنی بیٹی کے خوبصورت، معصوم چہرے کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر تندی کا تاثر تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ یہ موسیقی پر ارتکاز کی وجہ سے نہیں ہے۔ موسیقی کا اس میں فطری رجحان تھا۔ ایک بار ایک دھن بجا لیتی تو اس کے بعد وہ دھن اس کے لئے کوئی مسئلہ نہ رہتی۔

اس نے بڑی مہارت سے دھن ختم کی اور چند لمحے ساکت بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں کہیں دور دیکھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر وہ جیسے اس انجانی دنیا سے واپس آ گئی جہاں وہ دھن اسے لے گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بے حد خوبصورت مسکراہٹ اور آنکھوں میں ستارے چمکتے نظر آئے۔ "خوبصورت ہے نا ڈیڈی؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں.........لیکن میری بیٹی سے کم۔"

"ڈیڈی ....مذاق نہ کریں۔" وہ شرما گئی۔ اس کا شرمانا مجھے بلقیس کی یاد دلاتا تھا "اچھا.........میں آپ کے لئے سینڈوچ بنا کر لاؤں؟"

"نہیں بیٹا شکریہ!"

"تو ٹھیک ہے، میں کافی لاتی ہوں آپ کے لئے۔" یہ کہہ کر وہ کچن کی طرف لپک گئی۔ میں باہر لان پر چلا گیا۔ میں چھوٹے سرسبز ٹیلے پر کھڑا ہو کر نیچے دیکھتا رہا۔ پھسلواں مرغزار دریائے ہڈسن پر جھکتے.........اس سے ملتے نظر آ رہے تھے۔ خزاں کا آغاز ہو چکا تھا۔ درختوں سے پتے جھڑنے لگے تھے۔ آنے والے تین مہینوں میں دریا کو برف ہو جانا تھا اور درختوں کو ٹنڈ منڈ۔ شاخوں کو برف سے ڈھک جانا تھا۔ اس لمحے وطن مجھے شدت سے یاد آیا۔ بلقیس یاد آئی۔ حنا میری اور بلقیس کی بیٹی ہوتی تو زندگی کتنی خوشگوار اور خوبصورت ہوتی۔ امریکہ نے مجھے سب کچھ دیا تھا لیکن یہ احساس کبھی نہیں دے سکا تھا کہ

میری جڑیں یہاں ہیں۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی بیٹی کو کانکرڈ اکیڈمی نہیں بھیجوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ بلوغت کو پہنچتے ہی وہ پاکستان جانے کا فیصلہ کرے گی۔ میں اس کا ساتھ دوں گا..........

اچانک جیسے کسی نے میرے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ ایسی تکلیف .... ایسی اذیت مجھے زندگی میں صرف ایک بار محسوس ہوئی تھی۔ اس زندگی میں نہیں، پچھلی زندگی میں۔ میرے گھٹنے مڑ گئے۔ ٹانگیں بے جان ہو گئیں۔ مَیں نیچے گرنے لگا۔ مَیں نے وہ دن .... تاریخ یاد کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آیا۔ بس میں یہ سوچنے میں کامیاب رہا کہ خدا نے مجھے جو ایک اور موقع دیا تھا، مَیں نے اس میں کیا کھویا اور کیا پایا۔ مَیں نے صرف دولت کمائی تھی اور ایک بیٹی۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ زندگی کی سچی خوشیوں سے مَیں محروم ہی رہا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ دولت لازمی طور پر خوش حالی نہیں دیتی۔ خوشیوں کی ضمانت نہیں ہوتی۔ پھر خوشی اور سکون کیسے ملتا ہے؟ میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا۔ مگر اسی لمحے اذیت کی تاریکی نے مجھے پوری طرح نگل لیا۔

☆==========☆==========☆

میرے اردگرد تاریکی تھی اور چیخیں۔ کسی ہاتھ کے ناخن سختی سے میرے بازو میں چبھ رہے تھے۔ سامنے .... شاید وہ جہنم کا منظر تھا۔ روتے چیختے ہوئے بچے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے لیکن جھپٹا مارتے ہوئے پرندوں سے ان کے لئے کہیں نجات نہیں تھی۔ پرندے بچوں کے چہروں پر، آنکھوں پر پنجے مار رہے تھے۔

پھر سنہرے بالوں والی ایک عورت نے دو بچوں کو کار میں گھسیٹ لیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ مَیں فلم دیکھ رہا ہوں .... الفریڈ ہچکاک کی دی برڈز!

منظر کی دہشت ناکی میں کمی ہوئی تو میرے بازو پر موجود گرفت بھی ہلکی پڑ گئی۔ مَیں نے سر گھما کر جوڈی گورڈن کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خجل مسکراہٹ تھی۔ میرے بائیں جانب پاؤلا بیٹھی تھی۔ اس نے برابر بیٹھے مارٹن بیلے کا بازو تھام رکھا تھا۔

مَیں نے جان لیا کہ وہ ۶۳ء ہے۔ زندگی کا پُراسرار چکر پھر شروع ہو گیا ہے!

فلم ختم ہو گئی۔ ہم باہر نکل آئے لیکن میں گم صم تھا۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ مَیں نے جو کچھ بھی حاصل کیا تھا پنسل کی تحریر کی طرح ربڑ کی مدد سے مٹا دیا گیا ہے۔ وہ دولت، وہ

عظیم الشان گھر اور میری بیٹی حنا .... میری چہیتی حنا .... سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔

وہ سب کچھ حقیقت تھا یا واہمہ .... یہ کیا چکر ہے؟ یہ میرے ناشکرے پن کی سزا ہے یا قدرت کی طرف سے کوئی انعام۔ مجھ سے اصرار کیا جا رہا ہے کہ زندگی کی سچی خوشیاں حاصل کرو تاکہ مرتے وقت مطمئن اور شکرگزار ہو اپنے رب کے۔ پچھتاوے نہ ہوں .... تاسف نہ ہو۔ زندگی کے رائیگاں ہونے کا احساس نہ ہو۔

"تم کہاں کھوئے ہوئے ہو آفاق؟" جوڈی نے مجھ سے پوچھا۔ مگر مَیں ٹال گیا۔

☆==========☆==========☆

ریس سے پہلے، جمعے کی رات ہیرس ہال میں رقص پارٹی تھی۔ پارٹی اب ختم ہونے والی تھی۔ لڑکیوں کو اپنے ہوسٹل واپس جانا تھا۔ چنانچہ یہ آخری منٹ بے حد پُرجوش تھے۔ مَیں اور جوڈی رقص کرنے کے بجائے ایک بینچ پر بیٹھے تھے۔ جوڈی بہت اپ سیٹ تھی

"یہ سب فرینک میڈوک کا کیا دھرا ہے .... ہے نا؟ میں جانتی ہوں، یہی بات ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ یہ تجویز میری ہی تھی۔"

لیکن جوڈی کچھ سننے کو تیار نہیں تھی۔ "تمہیں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہئے۔ وہ تو خود کو بڑی چیز سمجھتا ہے۔ اس جیسوں کی صحبت میں اور کیا ملے گا تمہیں۔"

"مَیں کہہ رہا ہوں اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ آئیڈیا میرا اپنا ہے .... اور کامیاب بھی ثابت ہو گا۔ بس کل تک انتظار کر لو۔ پھر خود دیکھ لینا۔"

"تمہیں پتہ کچھ ہے نہیں اور چلے ہو شرط لگانے۔" جوڈی نے بھنا کر کہا۔ "ابھی تو تم خود شرط لگانے کے اہل تک نہیں ہو۔ تبھی تو فرینک کی مدد کی ضرورت پڑی تمہیں۔ خود سوچو.........."

"میں شرطوں کے متعلق بہت کچھ جانتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اپنی کار تک بیچ دی تم نے۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا کہ تم گھڑ دوڑ کے اتنے شائق ہو گئے ہو.........."

"کل سہ پہر کو میں نئی کار خرید لوں گا۔ تمہیں ساتھ لے کر چلوں گا مَیں۔ کون سی کار پسند کرو گی؟ بولو .... جیگوار یا کورویٹ؟"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو آفاق! میرا خیال تھا کہ میں تمہیں سمجھتی ہوں

لیکن............" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے سہلانے لگا۔ میرے ہاتھ کے لمس نے اسے نرم کر دیا۔ "میں پریشان ہوں تمہارے لئے۔"

"تم بالکل فکر نہ کرو ہنی۔ یہ بتاؤ، کل میرے ساتھ کار خریدنے چلو گی؟"

"مجھے کل ایک ٹیسٹ کے لئے تیاری کرنی ہے لیکن اگر تم سات بجے آ جاؤ تو مَیں تمہیں ڈولیز میں برگر کھلا دوں گی۔ تمہارے پاس تو اب کچھ بھی نہیں بچا نا!" اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ "اور سنو .... ہار جاؤ تو رونے نہ بیٹھ جانا۔ یہ کیا کم ہے کہ تمہیں ایک اچھا سبق مل جائے گا۔"

"بہت بہتر مام۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

☆==========☆==========☆

اگلی شام سات بجے مَیں اپنی نئی جیگوار میں جوڈی کو لینے پہنچا تو وہ حیران رہ گئی۔ پھر مَیں اسے ڈولیز کے بجائے دی کوچ اینڈ ہیکس میں لے گیا۔ وہ حیران تھی۔ اس وقت اس کی معصومیت نے میرا دل چھو لیا۔ وہ شرلا، ڈیانا اور بلقیس تینوں سے زیادہ اچھی لگی مجھے۔

کھانے کے بعد میں نے اسے وہ چھوٹا جیولری باکس دیا۔ اس نے باکس کھولا اور دو قیراط کے اس بے داغ ہیرے کی انگوٹھی کو چند منٹ تک ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی پھر وہ رونے لگی۔ اس نے بہت احتیاط سے باکس بند کیا اور اسے میز پر رکھ دیا۔ "نہیں .... یہ میں نہیں لے سکتی۔"

"کیوں .... تم تو کہہ رہی تھیں کہ مجھ سے محبت کرتی ہو۔"

"وہ تو میں کرتی ہوں۔ اس سے کب انکار ہے مجھے۔"

"تو پھر کیا بات ہے۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ ہم کم عمر ہیں تو دو ایک سال بعد سہی لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ بات طے ہو جانی چاہئے۔"

اس نے نیپکن سے اپنی آنکھیں خشک کیں اور بولی۔ "پاؤلا کہہ رہی تھی کہ تم نے ہفتوں سے کوئی کلاس اٹینڈ نہیں کی ہے۔ ممکن ہے کہ تم کالج سے نکال دیئے جاؤ۔"

میں مسکرا دیا۔ "اتنی سی بات؟ میں تو خود کالج چھوڑنے کے موڈ میں ہوں۔ میں نے ابھی ۱۷ ہزار ڈالر جیتے ہیں اور اکتوبر تک .... خیر چھوڑو تم اس کی فکر نہ کرو۔ اس بات کی میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ ہمارے پاس دولت کی کبھی کمی نہیں ہو گی۔"

"کیسے؟ جوئے اور شرطوں کے ذریعے!" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اس طرح زندگی گزاریں گے ہم؟"

"نہیں، شیئرز کی خرید و فروخت غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام نہیں ہے۔ تم نہیں جانتیں، میں کاروباری جینئس ہوں.........."

"حقیقت پسندی سے کام لو آفاق! تم نے بس ایک گھوڑے پر شرط جیت لی ہے اور تمہیں گمان یہ ہو رہا ہے کہ تم شیئر مارکیٹ کے بادشاہ ہو گئے۔ اس کے اچانک اتار چڑھاؤ کو تم کیا سمجھو۔"

"میں سمجھتا ہوں۔"

"بالکل نہیں۔ میرے ڈیڈی کہتے ہیں.........."

"مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ تمہارے ڈیڈی کیا کہتے ہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ مجھے اور تمہیں دولت کی کمی کبھی نہیں ہو گی۔"

اس نے کرسی پیچھے کھسکائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے پرواہ ہے۔ مَیں اپنے ڈیڈی سے یہ کہوں کہ میں ایک ایسے ۱۸ سالہ لڑکے سے شادی کر رہی ہوں جو جواری بننے کے لئے تعلیم ترک کر رہا ہے۔"

مجھے اچانک احساس ہوا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ جو میں جانتا تھا، اسے سمجھا نہیں سکتا تھا۔ اسے کیا، کسی کو بھی نہیں سمجھا سکتا تھا۔ میں جلد بازی کر رہا تھا۔ وہ بہت پیاری لڑکی تھی لیکن پچھلی بار ڈیانا سے شادی کا تجربہ اچھا نہیں تھا لہٰذا مجھے جوڈی کو تبدیلیٔ مذہب پر بھی قائل کرنا تھا۔ اس کے لئے خود کو بہت اچھا بھی ثابت کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے انگوٹھی جیکٹ کی جیب میں رکھ لی۔ "ٹھیک ہے جوڈی۔ فی الحال میں اسے رکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن تم اسے قبول کر لو گی۔ میں بھی تعلیم کے سلسلے میں اپنا رویہ بدلوں گا۔"

اس کی آنکھیں پھر نم ہو گئیں۔ "پلیز آفاق! میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ میں تمہیں ایک کامیاب انسان دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے جوڈی۔ انشاء اللہ ایک دن تم مجھ پر فخر کرو گی اور یہ انگوٹھی بھی بخوشی پہنو گی۔"

☆==========☆==========☆

جون ۶۸ء میں میری جوڈی سے شادی ہوئی۔ میرے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے ایک ہفتے بعد۔ اس وقت تک جوڈی اسلام سے بڑی حد تک متاثر ہو چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جلد ہی وہ مسلمان ہو جائے گی تاہم میں اس پر زور نہیں ڈال رہا تھا۔

ابو، امی اور کوثر شادی میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ مجھے خوشی تھی کہ امی نے جوڈی کو بلقیس اور ڈیانا سے زیادہ پسند کیا تھا۔ کوثر تو جوڈی کی دیوانی ہی ہو گئی تھی۔ میں نے اس موقع پر پھر ابو کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی انڈسٹری فروخت کر دیں اور امریکہ میں سیٹل ہو جائیں لیکن میں اس بار بھی انہیں قائل نہیں کر سکا۔

جوڈی کے والدین نے بھی مجھے بڑی خوش دلی اور محبت سے قبول کیا تھا۔ میں ۲۳ سالہ جوان تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، ذہین، محنتی اور ذمے دار۔ اس امیج کو بنانے کے لئے میں نے سخت محنت کی تھی۔ تعلیم کے پانچ سال میرے لئے بہت سخت اور بے زار کن تھے۔ خاص طور پر اس لئے کہ میں بغیر کچھ کئے بے حساب دولت بآسانی کما سکتا تھا لیکن میں ایسا کرتا تو جوڈی مجھ سے دور ہو جاتی اور پچھلی زندگی میں، میں نے جان لیا تھا کہ دولت خوشی اور سکون کی ضمانت ہرگز نہیں۔

اس بار میں اور فرینک میڈوک کینٹکی ڈربی کے فوراً بعد جدا ہو گئے تھے۔ وہ اپنی تعلیم میں لگ گیا تھا اور اب پٹس برگ کی ایک فرم میں جونیئر اٹارنی تھا۔ مَیں نے شادی کے بعد چیشائر برج روڈ پر ایک پرانے طرز کا مکان خرید لیا تھا اور فائیو پوائنٹس کے قریب ایک بلڈنگ میں چار کمروں کا دفتر لے لیا تھا۔ ہفتے میں پانچ دن میں سوٹ اور ٹائی میں وہاں جاتا۔ اپنی سیکرٹری اور دیگر ساتھیوں کو گڈ مارننگ کہتا اور اپنے کمرے میں بند ہو کر ادب پڑھتا رہتا۔ یہ وہ کتابیں تھیں جنہیں میں پڑھنا چاہتا تھا مگر جن کے مطالعے کا مجھے کبھی وقت نہیں مل سکا تھا۔

دن کے اختتام پر میں اپنے ساتھیوں کے لئے چند میمو لکھتا جن میں حصص خریدنے کی سفارشات ہوتیں۔ میں نے اپنا سرمایہ تیزی سے بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی پھر بھی اس میں اضافے کی رفتار خاصی تیز تھی۔ اس بار میں محتاط انداز میں کام کر رہا تھا۔

میرے پارٹنر میرے مشوروں پر عمل کرتے تھے کبھی عمل نہ کرتے تو نفع نقصان کی شیٹ برابر ہو جاتی۔

رات کو میں اور جوڈی ٹی وی دیکھتے۔ کبھی کبھی سونے سے پہلے اسکریبل کا ایک گیم کھیلتے۔ ویک اینڈ پر میں اور جوڈی کبھی جھیل میں کشتی رانی کے لئے نکل جاتے اور کبھی ٹینس کھیلتے۔ زندگی بے حد پُرسکون اور مرتب انداز سے گزر رہی تھی۔ مجھے اپنی بیٹی حنا بہت یاد آتی تھی۔ بس وہی ایک کمی محسوس ہوتی تھی۔ ۷۲ء میں جوڈی اور میں پاکستان گئے۔ وہاں ابو مسائل سے دوچار ہو چکے تھے۔ ہم نے کوثر کی شادی کرائی اور ابو اور امی کے ساتھ واپس آ گئے۔ ابو اور امی بھی امریکہ میں بہت خوش تھے۔ مگر انہیں کسی پوتے پوتی کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ پاکستان میں قیام کے دوران جوڈی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ میں نے اس کا نام شاہدہ رکھا تھا۔

☆==========☆==========☆

میں اور شاہدہ ساحل پر بیٹھے تھے۔ میں ہر سال چھ ہفتے کی چھٹیاں گزارنے کہیں نہ کہیں جایا کرتا تھا۔ صرف شاہدہ کے ساتھ۔ اس بار ہم جمیکا چلے آئے تھے۔

"خوبصورت خاتون کے لئے نیکلس لے لیں سر!" لڑکے نے کہا۔ وہ جمیکن تھا، عمر آٹھ نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں سیپیوں، کوڑیوں اور گھونگوں کے کوئی درجن بھر ہار تھے۔ اس کی کمر سے کپڑے کا ایک تھیلا جھول رہا تھا۔ اس میں اسی طرح کے بُندے اور دوسری چیزیں تھیں۔

"یہ ہار کتنے کا دو گے؟" میں نے لڑکے سے پوچھا۔

"آٹھ شلنگ کا۔"

"نہیں بھئی! کمی بیشی تو کرنی ہو گی تمہیں۔" میں نے کہا۔

"تو پھر آپ ہی بتا دیں سر!"

"ایک پاؤنڈ چھ شلنگ کا دو تو ابھی لے لوں۔"

لڑکا پریشان نظر آنے لگا۔ "سر، آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ لوگ قیمت کم کراتے ہیں، آپ بڑھا رہے ہیں۔"

"اب تو دو پاؤنڈ کا لوں گا۔ اس سے کم میں نہیں۔"

"اب میں آپ سے بحث تو کرنے سے رہا۔ ٹھیک ہے سر!" لڑکے نے جلدی سے ہار میری طرف بڑھا دیا۔ "اور کچھ خریدیں گے سر؟ یہاں ساحل پر سب مجھے جانتے ہیں۔ میرا نام ریناڑڈ ہے سر!"

"شکریہ، ریناڑڈ! تم سے بزنس کر کے خوشی ہوئی مجھے۔" میں نے اس کی طرف ایک ایک پاؤنڈ کے دو نوٹ بڑھائے۔ وہ نوٹ لے کر تیزی سے کھسک لیا۔ شاہدہ نے ہار گلے میں پہنا اور مسخرے پن سے مجھے دیکھا۔ "شرم تو نہیں آتی۔ اتنے سے بچے کے ساتھ مذاق کرتے ہو۔"

"شکر ہے اس نے بحث نہیں کی زیادہ۔ ورنہ کیا پتہ اسے ہار پانچ پاؤنڈ میں بیچنا پڑ جاتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شاہدہ ہار کو ٹھیک طرح سے پہننے لگی۔ پھر اچانک اس کی آنکھوں میں اداسی تیر گئی "تم بچوں میں کتنے خوش رہتے ہو۔" وہ بولی۔ "بس یہی ایک پچھتاوا ہے مجھے، کاش خدا نے ہمیں.........."

میں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ "تمہی میری بے بی گرل ہو۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔" میں اسے کیسے بتاتا۔ مجھے احساس تھا کہ یہ اس کے ساتھ بھی زیادتی ہے مگر میں بھی مجبور تھا۔ پچھلی زندگی میں حنا کو گنوانے کے بعد اب مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں اب شدید خواہش کے باوجود باپ بننا نہیں چاہتا تھا۔ کون جانے، مجھے پھر زندگی کو دہرانا پڑے اور پھر میں اپنے بچوں سے محروم، انہیں یاد کر کے تڑپتا رہوں۔ اس سے کہیں بہتر بے اولاد رہنا تھا۔

"آفاق، میں سوچ رہی ہوں.........."

میں نے اپنی اذیت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

"تم ابھی نہیں، خوب سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ سنو، ہم بچے گود لے سکتے ہیں۔"

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ اسے اور اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی محبت کو دیکھتا رہا۔

ہاں.......... وہ محبت اور بھرپور اظہار چاہتی تھی۔ میں نے سوچا، اس میں حرج ہی کیا ہے۔ وہ میرے اپنے بچے تو نہیں ہوں گے۔ ان سے بچھڑ کر میں ویسے تو نہیں تڑپوں گا جیسے حنا کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ "ہاں شاہدہ، میرا بھی دل چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔

☆==========☆==========☆

ہم نے پاکستان جا کر دو بچے گود لئے تھے۔ ایک لڑکا، ایک لڑکی۔ ایک سے ہماری تسلی نہیں ہو سکتی تھی۔ لڑکے کا نام سلمان تھا اور لڑکی کا ہما۔ دونوں کی عمروں میں دو سال کا فرق تھا۔ ان کے والدین مر چکے تھے۔ پہلے ہی سال میں انہیں سیلنگ پر لے گیا۔ شاہدہ مخالفت کر رہی تھی مگر میں انہیں جلد از جلد مانوس کر لینا چاہتا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ اس سلسلے میں ابو اور امی سے بہت مدد ملی۔ وہ دونوں تو ویسے ہی بچوں کو ترس رہے تھے۔ انہوں نے اپنی تمام محبت دونوں بچوں پر نچھاور کر دی۔ پھر میں اور شاہدہ بھی تھے۔ بچوں کے لئے وہ جلد ہی ان کا اپنا گھر بن گیا۔

بچوں کا تجسس اور تخیل میرے لئے مسحور کن تھا۔ وہ ایسا سحر تھا جو کبھی نہیں ٹوٹتا تھا۔ میں اس تھکی ہوئی پرانی گھسی پٹی دنیا کو ان کی متجسس نگاہوں سے دیکھتا تھا تو وہ مجھے نئی لگتی تھی۔ بچوں کی آمد نے مجھے نیا ولولہ دیا تھا۔ میں نے فوری طور پر آمدنی میں اضافے کی طرف توجہ دی تھی۔ نیا.......... اور نسبتاً بڑا مکان بھی خرید لیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ہر سال موسم گرما میں بچوں کو کہیں نہ کہیں لے جایا کروں گا۔ پوری دنیا دکھاؤں گا انہیں اور پھر ان کی معصوم نظروں سے اس بوڑھی اور پرانی دنیا کو خود بھی دیکھوں گا.......... انجوائے کروں گا۔

اس بار بھی میرے والدین ۸۸ء میں ہی جدا ہوئے۔ میں نے اپنی صحت کا پوری طرح خیال رکھا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میرے لئے وہی وقت مقرر ہے۔

☆==========☆==========☆

یہ ۹۳ء تھا۔ تین دن ہو گئے تھے۔ میں نے ای سی جی کو ایک لمحے کے لئے بھی اپنے سینے سے الگ نہیں ہونے دیا تھا۔ جہاں جہاں الیکٹروڈز میرے سینے پر ٹیپ سے چپکائے گئے تھے وہاں وہاں میرا سینہ اب دکھنے لگا تھا۔ میں جانتا تھا کہ نرسیں مجھ سے بے زار ہو چکی ہیں۔ وہ میرا مذاق اُڑاتی تھیں۔ انہیں میں برا لگتا تھا کہ صحت مند ہو کر بھی ایک بستر گھیرے لیٹا ہوں۔ ڈاکٹر کا بھی یہی حال تھا بلکہ اس نے تو یہ بات کھل کر کہہ دی تھی مجھ سے لیکن میں اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا تھا۔ اپنی بات منوانے کے لئے مجھے ہسپتال کو عطیے میں بھاری رقم دینی پڑی تھی۔ آخر کار مجھے ہسپتال میں داخل کر لیا گیا تھا۔ وہ اکتوبر ۹۳ء کے

تیسرے ہفتے کا آغاز تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جو کچھ ہونا ہے، اسی عرصے میں ہونا ہے۔

اس وقت شاہدہ مجھ سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ ”کیسے ہو آفاق؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”سینہ دکھنے کے سوا سب خیریت ہے۔“ میں نے بتایا۔

وہ مسکرائی۔ اس کی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں ”اب یہ وائرنگ کھلوا دو نا۔ روبوٹ سے انسان بن جاؤ۔“ وہ بولی۔

میں بھی مسکرا دیا۔ ”ابھی کم از کم دو تین دن تو میں آزاد نہیں ہونا چاہتا۔“

اس نے کتابوں کا شاپنگ بیگ میری طرف بڑھا دیا ”چلو .... میں تمہارے لئے مصروفیت کا سامان تو لے آئی ہوں اور کچھ کیسٹ بھی ہیں۔“ اس نے ایک کیسٹ لگا دیا۔

وہ غلام علی کی غزلوں کا کیسٹ تھا۔ وہ میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی لیکن مجھے سمجھتی تھی۔ سمجھنے کی کوشش بھی کرتی رہتی تھی۔

”شاہدہ ....“ میری آواز بھرا گئی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”میں تمہیں بس اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے تم سے ہمیشہ بڑی سچی محبت کی ہے۔“

اس نے ہموار لہجے میں جواب دیا لیکن اس کی نگاہوں سے پریشانی جھلکنے لگی تھی۔ ”مجھے یقین ہے، ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے رہیں گے .... برسوں تک، مدتوں تک۔“

”ہاں، جب تک زندگی رہی۔“ میں نے کہا۔ شاہدہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میں نے اشارے سے اسے روک دیا۔

وہ مجھ پر جھک آئی۔ ”بس اب جلدی گھر واپس آ جاؤ۔ ابھی تو ہم نے زندگی کا آغاز کیا ہے۔“

گڑبڑ اس وقت ہوئی جب شاہدہ ہسپتال کے کیفے ٹیریا میں کھانا کھانے کے لئے گئی تھی۔ مجھے خوشی تھی کہ اس موقع پر وہ موجود نہیں ہے اور مجھے مرتے نہیں دیکھ سکے گی۔

تکلیف کے باوجود میں نے نرس کی حیرت صاف دیکھ لی۔ ای سی جی اچانک ہی اور بالکل غیر متوقع طور پر بے ترتیب ہو گیا تھا۔ جیسے سکرین پر دیوانگی طاری ہو گئی ہو۔ بہرحال پروفیشنل نرس نے خود پر قابو پائے رکھا۔ اس نے فوری طور پر خطرے کی گھنٹی

بجائی اور اگلے ہی لمحے مَیں ڈاکٹروں میں گھرا ہوا تھا۔ کمرے میں چیخ پکار مچ گئی۔ ڈاکٹر چیخ چیخ کر ہدایات دے رہے تھے۔

ہدایات کا سلسلہ جاری رہا۔ مجھے دوائیں دی جاتی رہیں۔ انجکشن لگائے جاتے رہے لیکن ان کی آوازیں اور کمرے کی روشنی مدھم ہوتی گئی۔ میں غصے میں چیخنا چاہتا تھا کہ یہ زیادتی ہے .... بے انصافی ہے۔ اس بار تو میں پوری طرح تیار تھا لیکن میرے منہ سے آواز بھی نہیں نکلی میں کچھ بھی نہ کر سکا .... سوائے خاموشی سے مرجانے کے!

☆==========☆==========☆

میری آنکھ کھلی تو میں مارٹن بیلے کی کار کی عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ جوڈی میرے ساتھ تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ وہ شاہدہ ہے مگر پھر مجھے خیال آ گیا۔ ابھی وہ شاہدہ نہیں تھی، سولہ سالہ جوڈی گورڈن تھی۔ میری بیوی نہیں، ۶۳ء کی دوست جوڈی گورڈن!

”کار روکو۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

”ذرا رکو۔ ہم گرلز ہوسٹل پہنچنے ہی والے ہیں۔“ مارٹن بیلے نے مجھے تسلی دی۔

”میں کہتا ہوں، کار روکو۔ فوراً روکو۔“

مارٹن نے بریک لگا دیئے۔ جوڈی نے میرا ہاتھ تھام کر کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اسے جھٹک دیا۔ میں نے دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟“ مارٹن نے چیخ کر پوچھا لیکن میں نے اترتے ہی اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے سمتوں کا احساس بھی نہیں تھا۔ مجھے سمتوں کی .... بلکہ کسی بھی چیز کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

میں دوڑتا رہا۔ میرا دل سینے کے اندر، پسلیوں پر یوں ٹھوکریں مارتا رہا، جیسے بے وفا نے ابھی چند منٹ پہلے ہسپتال میں مجھے دھوکا دیا ہی نہیں تھا۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ یہ چند منٹ پہلے کی نہیں، مستقبل میں تیس سال بعد کی بات ہے۔ میرے اندر غصہ اُبل رہا تھا۔ میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں تھا۔

اچانک مجھے ٹھوکر لگی۔ میں گرا۔ میں نے سر اٹھا کر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ستاروں بھرے آسمان کو دیکھا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو میرے ساتھ۔“ مَیں دھاڑا۔ ”میرا قصور کیا ہے؟ بس بہت ہو گیا اب مجھے مرہی جانے دو۔ مَیں تماشا نہیں بننا چاہتا۔“

مجھے اپنے اندر ایک اجنبی آواز سنائی دی۔ بے حد واضح اور صاف۔ "تم خوش قسمت ہو، تمہیں شکر ادا کئے بغیر نہیں مرنے دیا جائے گا۔ جب تک تمہیں سکون اور طمانیت حاصل نہیں ہو جاتی، تم نہیں مرسکتے۔ شکر ادا کرو، شکر۔"

"شکر؟ کس بات کا؟"

"ہر بات کا۔" اندر سے جواب ملا۔ "کتنا نوازا گیا ہے تمہیں۔ اس کا احساس بھی ہے۔"

اچانک مجھ پر بے بسی طاری ہو گئی۔ "اے خدا........... تیرا شکر ہے۔ تُو نے واقعی مجھے بہت نوازا۔ شکر ہے تیرا.........." لیکن میرے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

"یوں نہیں، دل کی، روح کی گہرائیوں سے شکر ادا کرو۔" اندر سے آواز آئی اور پھر اندر یوں سناٹا چھا گیا جیسے بہت بلند آواز میں بجنے والے ریڈیو کو آف کر دیا گیا ہو۔

☆==========☆==========☆

مجھے اب کسی بات کی، کسی چیز کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ سبھی کچھ تو میں کر چکا تھا۔ دولت، محبت، اولاد.......... سبھی کچھ مل چکا تھا مجھے مگر سب بے کار لا حاصل..........

اب میں پھر اکیلا اور لاچار تھا۔ دونوں ہاتھ بھی خالی تھے اور دل بھی اور پھر وہی آغاز۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیوں کچھ کیا جائے۔ کیونکہ آخر میں تو سبھی کچھ چھن جانا ہے۔ ہاتھ میں کچھ بھی تو نہیں رہتا۔ تتلیاں اڑ جاتی ہیں۔ ہاتھوں میں بس رنگ رہ جاتے ہیں تھوڑی دیر کے لئے اور پھر وہ بھی نہیں رہتے۔

میں جوڈی کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مجھے بڑی محبت دی تھی۔ میں نے بھی اسے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا لیکن اب جوڈی وہ عورت نہیں تھی جس سے میں نے محبت کی تھی۔ وہ ایک خالی سلیٹ تھی، جس پر میں اپنی محبت تحریر کر سکتا تھا مگر میں وہ سب کچھ دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ میں کوئی ایسی چیز حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا جو بعد میں چھن جائے اور میں تہی دامن رہ جاؤں۔ میرے پاس ملال اور پچھتاووں کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔ میں کوئی ایسی چیز حاصل کرنا چاہتا تھا جو کبھی نہ چھنے۔ ہمیشہ میرے پاس رہے۔ مگر ایسی کون سی چیز ہو سکتی ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

میں نے اس بار بھی زندگی کے ایک حصے کو دہرایا۔ فرینک میڈوک اور جینیوگے والا

حصہ.......... دولت کمانے والا حصہ۔ شرط جیتتے ہی میں لاس ویگاس چلا گیا۔ وہاں شرلا بیکر سے ملا جو مجھ سے پہلی بار مل رہی تھی۔ "میں ایفاک عباسی ہوں۔" میں نے اپنا تعارف کرایا۔

"شرلا بیکر۔" وہ مسکرائی۔

"پیرس چلنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے بلا تمہید کہا۔

"کیوں نہیں۔" وہ پھر مسکرائی۔ "مگر پہلے خود کو دولت مند ثابت کرو۔"

یہ میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ ہم پیرس چلے گئے۔ اس بار پیرس میں، میں نے پوری طرح بے راہ روی کا مزہ چکھا بلکہ اسے اپنا لیا۔ میں نے ہر نشے کو آزمایا۔ میں کچھ یاد نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا میں۔ میں شرلا کے ساتھ پیرس کی عیش پسند سوسائٹی میں کھو گیا۔ میں نے کبھی شرلا سے نہیں پوچھا کہ اس نے رات کہاں گزاری ہے۔ اس نے بھی مجھ سے یہ سوال نہیں کیا۔

وہاں اس بار ہمارے کچھ دوست بھی بنے۔ ان میں جین کلاڈ اور اس کی گرل فرینڈ میریل بھی تھے۔ میریل اور میں ایک دوسرے سے بہت تیزی سے قریب ہوئے تھے۔ میریل منشیات کا استعمال کرتی تھی۔ اس نے مجھے چرس اور افیون کے اشتراک سے روشناس کرایا۔ ایسے ہی ایک موقع پر نشے اور سرشاری نے میری زبان پر پڑے تالے کو کھول دیا۔ میرے دل و دماغ پر جو بوجھ تھا جسے میں کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتا تھا، وہ میں نے میریل کے سامنے ہلکا کر ڈالا۔

وہ مسکرائی۔ "پرانی زندگی، نئی زندگی۔ میں بھی کبھی کبھی ایسا ہی محسوس کرتی ہوں کہ میں اس دنیا میں پہلے بھی جی چکی ہوں۔ سب کچھ دیکھ چکی ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں محسوسات کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں اس عہد میں اب چوتھی بار جی رہا ہوں۔ تین بار جی چکا ہوں میں" میں نے اسے سب کچھ سنا ڈالا........... سب کچھ۔ اس وقت شام رات میں ڈھل رہی تھی۔ ہم ہوٹل کے گارڈن میں تھے۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اس کا چہرہ مجھے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اس کے تاثرات نہیں پڑھ سکتا تھا۔ کیا وہ مجھے پاگل سمجھ رہی تھی یا اس کے خیال میں میری بکواس چرس اور افیون کا شاخسانہ تھی، میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

اس نے میری بات خاموشی سے سنی تھی اور اب بھی خاموش تھی۔

"میریل، میرا مقصد تمہیں شاک پہنچانا نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "جتنے جنم اتنی اذیتیں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"یہ جنم نہیں ہیں۔ یہ ری پلے ہیں۔ میں ایک ہی دور میں بار بار جی رہا ہوں ...." میں نے کہا مگر پھر اس نے میرے ہونٹوں پر مہر لگا دی۔

☆==========☆==========☆

میریل سے دوبارہ اس موضوع پر کبھی بات نہیں ہوئی۔ شاید اس نے اسے نشے میں دھت آدمی کی بکواس سمجھ کر نظرانداز کر دیا تھا اور یہ بہتر ہی تھا۔ میری بے راہ روی کا سلسلہ جاری تھا۔ ہمارا گروپ کچھ اور بڑا ہو گیا تھا۔

ہم لندن چلے آئے۔ وہاں قیام کو ایک ماہ ہوا تھا کہ ایک لڑکی نے مجھے ایل ایس ڈی سے روشناس کرایا۔ مجھے ہر چیز ٹوٹی پھوٹی، مڑی تڑی اور چنگاریوں میں لپٹی محسوس ہونے لگی۔ مجھے ایل ایس ڈی اچھی نہیں لگی۔ بعد میں کبھی میں نے اسے استعمال نہیں کیا۔ اس کے نتیجے میں مجھے اس لڑکی کے چہرے میں اپنی حنا کی مشابہت نظر آنے لگی۔ میں نے اسے پرے دھکیل دیا۔

وقت گزرتا رہا۔ میرا دل اس بار کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ بیس بال والی شرط نے مجھے ایک بار پھر لکھ پتی بنا دیا تھا۔

پھر ہم سان فرانسسکو ائرپورٹ کے فرسٹ کلاس لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ شرلا کا چہرہ زرد تھا۔ "اور کتنی دیر ہے؟" اس نے تند لہجے میں پوچھا۔

"بس اب کسی بھی لمحے ہم جہاز پر ہوں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور وہاں پہنچنے میں کتنی دیر لگے گی؟"

"ساڑھے چار گھنٹے کی فلائٹ ہے۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔ "ہم اس سب سے پہلے بھی گزر چکے ہیں شرلا۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا چاہتے ہو۔ مجھے یاد ہے، تم نے کہا تھا کہ تم استوائی خطے سے بے زار ہو چکے ہو۔ برازیل چھوڑتے وقت یہی کہا تھا تم نے۔ تو اب ہوائی جانے کی

کیا تُک ہے آخر؟"

"مجھے سکون اور تنہائی کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے کچھ سوچنا ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے اس میں اور ہاں .... اس سب سے بھی ہم کئی بار گزر چکے ہیں۔"

اس نے مجھے زہریلی نظروں سے دیکھا اور کاٹ دار لہجے میں بولی۔ "یہی تو مصیبت ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ تم سب کچھ دیکھ چکے ہو، ہر مرحلے سے گزر چکے ہو۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "مطلب کیا ہے تمہارا؟"

"وہی خرافات کہ تم یہ زندگی کئی بار گزار چکے ہو۔"

میں نے کرسی پر پہلو بدلا اور اس کی کلائی مضبوطی سے تھام لی۔ "تم نے یہ کہاں سے سنا؟ میں نے تو کبھی............"

"ہاتھ چھوڑو میرا۔" اس نے جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "جیزز کرائسٹ، تم سے ذرا سا نشہ جھیلا نہیں جاتا۔ پرندوں کی طرح چہچہانے لگتے ہو۔ اِدھر اُدھر بھاگتے ہو اور پھر مجھے پکڑتے............"

"شٹ اپ شرلا! میں پوچھ رہا ہوں، یہ بات کہاں سے سنی تم نے؟"

"میریل نے مجھے بتایا تھا پچھلے سال کہ تم اس پر سریت لادنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ کہ تم مر چکے ہو اور دوبارہ بلکہ سہ بارہ جی رہے ہو۔ ہونہہ خرافات .... بکواس۔"

وہ مجھے کاری وار لگا۔ بہت بڑا جھٹکا تھا میرے لئے۔ میں اتنی زندگیوں میں اتنے لوگوں سے ملا تھا مگر میں نے اس سلسلے میں صرف میریل پر اعتبار کیا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ وہ میرے اس انکشاف پر فیصلہ صادر نہیں کرے گی۔ بس سنے گی اور اسے راز ہی رکھے گی لیکن .... "کیوں؟ اس نے تمہیں کیوں بتائی یہ بات؟" میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"لطیفے کیوں سنائے جاتے ہیں!" شرلا نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "تمہیں نہیں معلوم۔ پیرس میں ہمارے جتنے جاننے والے تھے، سب پیٹھ پیچھے تم پر ہنستے رہے۔ مہینوں ہنستے رہے۔"

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"میں نے میریل پر اعتبار کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا.........."

"بہت اچھا کیا تھا۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ اسے میں نے تمہاری طرف دھکیلا تھا۔ تمہیں اس موڈ سے نکالنے کے لئے۔ میں تو بے زار ہو گئی تھی تمہارے اس موڈ سے۔ میں تفریح کرنے کے لئے نکلی تھی اور تم کیا سمجھتے ہو، اگر میں اور جین کلاڈ حکم دیتے تو میریل کسی بندر کے پنجرے میں جا کر اس سے بھی اظہارِ محبت کر سکتی تھی۔"

اسی وقت ایک نسوانی آواز نے ہماری فلائٹ کے سلسلے میں اعلان کیا۔ میں شرلا کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھا۔ شرلا کے ہونٹوں پر طمانیت خیز مسکراہٹ تھی جبکہ میرا ذہن بے یقینی کی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ ہم جہاز پر سوار ہوئے اور اپنی سیٹ بیلٹس باندھ لیں۔ وہ بوئنگ ۷۰۷ تھا۔ جہاز کا کیپٹن اناؤنسمنٹ سسٹم پر اپنا اور اپنے عملے کا تعارف کرا رہا تھا۔ مگر میں بے زاری سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ قصور میرا اپنا ہے۔ اس ری پلے میں لاس ویگاس جا کر، شرلا سے مل کر میں نے بھاری غلطی کی تھی۔ شرلا کو تو میں جانتا تھا۔ بہرحال اب کیا ہو سکتا ہے۔ ہونے والی بات تو ہو چکی۔ اچھی بات یہ ہے کہ میریل سمیت کسی کو بھی میری بات پر یقین نہیں آیا لہٰذا کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔ کوئی خطرے کی بات بھی نہیں۔ بس اتنا ہوا ہے کہ میں ہمیشہ سے زیادہ اکیلا ہو گیا ہوں۔ میں زندگی کے صحرا میں اس مسافر کی طرح ہوں جسے تنہا بھٹکتے پھرنا ہے۔ جسے ہم سفر ملیں گے تو بس ذرا دیر کے لئے۔

جہاز ٹیک آف کر چکا تھا۔ میرے پاس دھیان بٹانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ کاش .... میں اپنے ساتھ کوئی کتاب لے آیا ہوتا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

اچانک جہاز بری طرح لرزا۔ ہلکا سا ایک دھماکہ ہوا۔ میری دہشت زدہ نگاہوں کے سامنے داہنی جانب والا آؤٹ بورڈ انجن جہاز سے علیحدہ ہوا اور پَر میں ایک مہیب سوراخ چھوڑ کر نیچے گرتا چلا گیا۔ وِنگ کے ساتھ والے ٹینک سے فیول ٹپک رہا تھا۔ پھر وہاں سفید شعلہ سا لپکا .... اور پھر پگھلے ہوئے لوہے کے بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹپکتے نظر آئے۔

"دیکھو .... وِنگ میں آگ لگ گئی ہے۔" پیچھے سے کوئی چلایا۔ اس کے ساتھ

ہی کیبن چیخوں سے بھر گیا۔ بچوں کی چیخیں بہت نمایاں تھیں۔

جلتے ہوئے وِنگ کا باہر والا ایک تہائی حصہ گر گیا۔ نیچے پہاڑیوں پر بنے ہوئے مکان اور بحرالکاہل کا نیلا پانی نظر آ رہا تھا۔ زیادہ نہیں، کوئی ہزار فٹ نیچے۔

شرلا نے میرا بایاں ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ میں نے بھی اس کے ہاتھ کو تسلی دینے والے انداز میں دبایا۔ اس لمحۂ ابتلا میں رنجشیں اور شکایتیں بے معنی ہو گئی تھیں۔ میں اس وقت خوف زدہ تھا۔ اس نئے ری پلے کو شروع ہوئے صرف دو سال ہوئے تھے۔ کیا میں اتنی جلدی مر جاؤں گا اور وہ بھی ایسی متشددانہ موت!

جہاز پھر لرزا اور داہنی جانب جھک گیا۔ گولڈن گیٹ برج نظر آنے لگا۔ اس کے ٹاور خوفناک حد تک قریب معلوم ہو رہے تھے "ہم ٹکرانے والے ہیں" شرلا ہذیانی انداز میں چلائی۔

جہاز اب لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ کیپٹن اناؤنسمنٹ سسٹم پر مسافروں کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ "اب ہم ٹریوس ائرفورس بیس پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ وہ کوئی چالیس میل دور ہے۔" کیپٹن کہہ رہا تھا۔ "وہاں بہت لمبا اور اچھا رن وے ہے اب میں مصروف ہو رہا ہوں۔ سیکنڈ آفیسر ویب اب آپ کو لینڈنگ کے متعلق بتاتا رہے گا۔"

"یہ خواہ مخواہ کی تسلیاں دے رہا ہے۔ جہاز کریش ہونے والا ہے" شرلا چلائی۔

"خاموش رہو۔" میں نے اسے ڈانٹا۔ "بچوں تک تمہاری آواز جا رہی ہے۔"

شرلا اب رو رہی تھی۔ میں اسے لپٹائے ہوئے دلاسے دے رہا تھا۔ دوسری طرف سیکنڈ آفیسر ویب کریش لینڈنگ کی صورت میں ہدایات ذہن نشین کرا رہا تھا۔ جہاز اب تیزی سے نیچے آ رہا تھا۔ پھر ایئرفورس بیس نظر آنے لگا۔ وہاں ہنگامی صورتِ حال تھی۔ فائر انجن بھی موجود تھے اور ایمبولینسیں بھی۔ جہاز نے ایک چکر لگایا۔ نیچے موجود بیرکیں اب محض سو فٹ نیچے تھیں۔

شرلا کچھ بڑبڑائے جا رہی تھی۔ شاید دعا کر رہی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ جہاں جہاز کو اترنا تھا وہاں گرد کا ایک بگولا اٹھتا دکھائی دیا۔ میں نے خود بھی سیکنڈ آفیسر کی ہدایت کے مطابق پوزیشن بنائی اور شرلا کو بھی اس کام میں مدد دی۔

اچانک ایک جھٹکا لگا اور جہاز بائیں طرف جھکا۔ پھر ڈگمگاتا ہوا جہاز سنبھلا اور چند

سیکنڈ رن وے پر دوڑتا رہا۔ وہ بہت سنگین لمحے تھے۔ پھر انجن گرجے۔ رفتار کم ہوتی گئی اور آخر کار جہاز رک گیا۔

تمام مسافر تالیاں بجا رہے تھے۔ اسٹیوارڈ نے ایمرجنسی ایگزٹس کھولے۔ مسافر اترنے لگے۔ میں نے دیکھا، ایک طرف جھکے ہوئے جہاز کے شکستہ داہنے پر کے رخنوں سے فیول ابل رہا تھا۔ میں نے شرلا کا ہاتھ تھاما اور جہاز سے دور دوڑ لگا دی۔ کوئی تین سو گز آگے جا کر ہماری ٹانگیں جواب دے گئیں۔ ہم دو رن ویز کے درمیان ڈھیر ہو گئے۔ اس دوران ملٹری کے فائر فائٹنگ یونٹ نے زخمی بوئنگ ۷۰۷ کو سفید جھاگوں میں نہلا دیا تھا۔ ہمارے اردگرد دوسرے مسافر ہماری ہی طرح نڈھال گرے پڑے تھے۔

"ایفاک .... ایفاک ...." شرلا سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میں نے اسے نرمی سے ایک طرف ہٹایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے کا میک اپ آنسوؤں نے جگہ جگہ سے دھو دیا تھا۔ وہ اس وقت بے حد کریہہ النظر لگ رہی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ قریب ہی ایک بلڈنگ تھی جو تمام سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ میں اس طرف چلنے لگا۔ شرلا بدستور نیچے گری روئے جا رہی تھی۔

"ایفاک!" اس نے مجھے پکارا۔ "مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ تم یوں نہیں جا سکتے اور اس واقعے کے بعد؟"

میں کہنا چاہتا تھا .... "کیوں نہیں۔" لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں اس عمارت کی طرف بڑھتا رہا۔

☆==========☆==========☆

میں نے ناشتہ کیا اور پلیٹیں دھوئیں۔ اس وقت تک سورج طلوع ہو چکا تھا۔ عام طور پر میں ناشتے کے بعد کافی کی پیالی لے کر پورچ پر جا بیٹھتا تھا لیکن اس صبح مجھے بہت کام تھے۔ میں نے جیکٹ پہنی اور باہر نکل گیا۔ وہ مئی کا تیسرا ہفتہ تھا لیکن ہوا کے ڈنک میں اب بھی جان تھی۔ میں نے پتھروں کے اس ڈھیر کی طرف دیکھا جہاں بڈھا اسمائیتھ دفن تھا۔ پھر میں مکئی کے کھیتوں کی طرف بڑھ گیا۔ زمین اب بوائی کے لئے پوری طرح تیار تھی۔ اسمائیتھ نے ۱۹ویں صدی کے اواخر میں اس زمین پر اکیلے کام کیا تھا۔ وہ ۱۸۸۰ء میں یہاں آباد ہوا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ بیمار پڑ گیا تھا لیکن کسی کو پتہ بھی نہیں چلا تھا بلکہ

اس کی لاش تک بھی وہ کافی بعد میں پہنچے تھے۔ پھر یہ زمین نیلام ہوئی تھی۔ جن لوگوں نے اسے خریدا، انہوں نے یہاں کاشت کاری نہیں کی بلکہ انہوں نے زمین بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ بڈھے اسمائیتھ کا چھپایا ہوا سونے کے سکوں کا خزانہ ملتے ہی وہ زمین بیچ کر نکل لئے۔

میں نے نرم کالی مٹی میں جوتوں کی ایڑیاں گاڑیں اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں میں سہ پہر میں موسم کی پہلی مکئی بونے والا تھا۔ وہ مٹی بہت زرخیز تھی۔ معدنیات سے بھی مالا مال تھی۔ مجھے ان لوگوں پر غصہ آتا تھا، جو سونے کے سکے لے کر رخصت ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس زمین کی ناقدری کی تھی۔ یہ زمین جو غلہ اگلتی تھی، وہ سونے کے سکوں سے کہیں قیمتی تھا۔

میں اس چشمے کے پاس بیٹھ گیا جو میری زمین پر بہتا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کی اوک میں ٹھنڈا پہاڑی پانی بھرا اور اسے پیا۔ جرمن نسل کی دو براؤن ٹراؤٹ مچھلیاں میرے سامنے سے گزریں۔ میں نے سوچا، بوائی سے فارغ ہونے کے بعد رات کے کھانے کے لئے دو تین مچھلیاں پکڑوں گا۔

سورج اب خاصا اوپر آ گیا تھا۔ ہوگ بیک ماؤنٹین کی ڈھلوانوں پر استادہ پائن کے درخت جیسے جل اٹھے تھے۔ میں چشمے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ہر پندرہ بیس فٹ کے بعد میں چشمے میں پڑے کنکروں کے ڈھیر کو ہٹا دیتا۔ اس چشمے پر میری کاشت کاری کا انحصار تھا۔ یہ زمین میں نے نو سال پہلے خریدی تھی .... ہوائی جانے والے بوئنگ ۷۰۷ کی کریش لینڈنگ کے دو ہفتے بعد۔ اس دن کے بعد میں نے شرلا کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی بلکہ درحقیقت میں کسی سے بھی نہیں ملا تھا۔ بس پچھلے سال میں نے ایک لاکھ ڈالر کی رقم ابو کو خصوصی ذرائع سے بھجوائی تھی۔ اس تاکید کے ساتھ کہ وہ کوثر کی شادی ڈھنگ سے کر دیں مگر میں نے انہیں اپنا پتہ نہیں دیا تھا۔ میں اب کسی سے بھی رابطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

یہاں میرا قریب ترین پڑوسی ٹرٹل پونڈ میں رہتا تھا۔ یہ جگہ میری زمین سے مشرق کی سمت تین میل کے فاصلے پر تھی۔ کچی سڑک تھی جس پر بس گھوڑا گاڑی چل سکتی تھی۔ میری زمینوں تک پہنچنا اور مشکل تھا۔ نومبر سے جنوری تک برف، بارش اور کیچڑ

مارل کریک کے ساتھ سفر کو تقریباً ناممکن بنا دیتی تھی۔ چنانچہ موسم سرما کے لئے میں غذا اور ضروری چیزیں پہلے سے ذخیرہ کر لیتا تھا۔

میں زیادہ تر اکیلا ہی رہتا تھا۔ موسم ٹھیک رہتا تو ہفتہ پندرہ دن میں ایک بار میں منٹگمری کریک کے قصبے میں اپنی گاڑی میں جاتا اور خریداری کرتا۔ کبھی وہاں اپنی پک اپ کی سروس کراتا۔ شراب نوشی میں نے بالکل ترک کر دی تھی۔ ایک فیملی سے میرے تعلقات تھے۔ کبھی اچھی فصل ہو جاتی تو ہم جشن مناتے۔ ایسے میں، میں بیئر قبول کر لیتا۔ وہ لوگ متجسس نہیں تھے۔ انہوں نے مجھ سے کبھی نہیں پوچھا کہ میں اتنی دور دراز جگہ کیوں آ بسا ہوں۔ ان کا بیٹا جو مجھ سے دو سال چھوٹا........... اور میرا اچھا دوست تھا، اس نے مجھے ایک شارٹ ویو ریڈیو بنا کر دیا تھا جو میرا بیرونی دنیا سے واحد رابطہ تھا۔ یہ شمالی کیلی فورنیا کا علاقہ تھا جہاں میں نے اپنی الگ تھلگ دنیا بسائی تھی۔

مجھے کم از کم ابتدا میں نسوانی قربت کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی شاید اس لئے بھی کہ میں بے راہ روی کی آخری حد سے گزر کر یہاں پہنچا تھا۔ پھر بھی مجھے حیرت تھی کہ اپنے وجود کے اس حصے سے ترک تعلق کس قدر آسان ہوتا ہے۔ مگر یہ غلط فہمی جلد ہی دور ہو گئی۔ ثابت ہو گیا کہ انسانی لمس کی ضرورت انسان کے لئے مسلمہ ہے لیکن میرے لئے یہ قربانی دینا ضروری تھا۔ میں اب چپ چاپ مر جانا چاہتا تھا۔ کسی سے کوئی دلی، جذباتی تعلق استوار کئے بغیر۔

میں اور صرف میں جانتا تھا کہ اب سے سات سال بعد ماؤنٹ سینٹ ہیلن دھماکے سے پھٹے گا۔ لاوا اگلے گا۔ میں ایسی قوتوں کے درمیان رہ رہا تھا جو پہاڑ کو بھی تباہ کر سکتی تھیں۔ پھر بناتیں اور پھر تباہ کرتیں۔ جیسے یہ بچے کا کھیل ہو۔ میں پہاڑ کی برفانی چوٹیوں سے نظریں چراتے ہوئے چشمے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

☆==========☆==========☆

سٹور میں مجھے ایک پوسٹر نظر آیا۔ سٹارسی! میں اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ "یہ .... یہ کیا ہے؟" میں نے سٹور کے مالک سے پوچھا۔

سٹور کے مالک نے میرے اشارے کی سمت دیکھا۔ پھر حیرت سے بولا۔ "بھائی کیا بہت اندر رہتے ہو۔ سٹارسی نہیں دیکھی تم نے؟"

"یہ ہے کیا بلا؟"

"فلم ہے اور غضب کی فلم ہے۔ تین چار ماہ پہلے میرے بچے مجھے زبردستی لے گئے تھے یہ فلم دکھانے۔ تب سے اب تک میں تین بار دیکھ چکا ہوں اور اب یہ یہاں ریڈنگ میں لگ رہی ہے تو شاید ایک بار اور دیکھوں .... گھر والوں کے ساتھ۔ سچ کہتا ہوں، ایسی کوئی فلم ہی نہیں بنی تھی اس سے پہلے۔"

"یعنی یہ مقبول فلم ہے؟"

"مقبول؟" وہ ہنسنے لگا۔ "کہتے ہیں، یہ اب تک کی سب سے بڑی مووی ہے۔ سو ملین ڈالر سے زیادہ بزنس کر چکی ہے اور اور اب بھی رش نہیں ٹوٹا ہے۔"

لیکن میں جانتا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ جاز سے پہلے کسی فلم نے اتنا بزنس نہیں کیا تھا اور جاز کو ابھی سال ڈیڑھ سال بعد ریلیز ہونا تھا اور مجھے یاد بھی نہیں تھا کہ میں نے ۷۴ء میں کبھی اس فلم کا نام سنا تھا۔ اس سال کی مقبول ترین فلمیں چائنا ٹاؤن اور گاڈ فادر تھیں۔ "یہ فلم ہے کس موضوع پر؟" میں نے سٹور کے مالک سے پوچھا۔

"میں بیان نہیں کر سکتا۔ لطف ہی غارت ہو جائے گا۔ واپس جانے سے پہلے فلم ہی دیکھ لو نا۔" اس نے کہا۔ "یقین کرو، تمہارا دل خوش ہو جائے گا۔"

میں متجسس ہو گیا اور یہ وہ جذبہ تھا جس سے میں مدتوں سے محروم تھا۔ اس پرانی، بوڑھی اور گھسی پٹی دنیا میں میرے لئے تجسس تھا ہی نہیں۔

"شو تین بج کر بیس منٹ پر شروع ہو گا۔" سٹور کے مالک نے بتایا۔ "میں تمہارا آرڈر تیار رکھوں گا۔ تم فلم دیکھ آؤ جا کر۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم فلموں کے رسیا معلوم ہوتے ہو۔"

"ہرگز نہیں۔ مجھے فلموں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن یہ فلم .... بس خود ہی دیکھ لو۔ سمجھ جاؤ گے۔ جاؤ .... میں تمہارا سامان تیار رکھوں گا۔"

☆==========☆==========☆

سٹارسی کے پرستاروں کی قطار ایک بلاک سے بھی زیادہ طویل تھی۔ مجھے تعجب ہوا۔ دیکھنے والوں میں ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگ تھے۔ چھ سال کے بچوں سے ستر سال کے بڈھوں تک۔ لوگوں کی گفتگو سے پتہ چل رہا تھا کہ بیشتر وہ فلم پہلے ہی کم از کم ایک بار دیکھ

چکے ہیں۔ فلم کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے لہجوں سے والہانہ محبت جھلکتی تھی۔

اور وہ فلم واقعی غضب کی تھی۔ سٹور کے مالک کے دعووں سے بھی آگے کی چیز۔ حد یہ ہے کہ میرے خیال میں بھی وہ برسوں بعد کی فلم تھی۔ عام لوگوں کی دیوانگی تو تھی ہی برحق۔ اپنی تھیم، اپنے لک اور اپنے سپیشل ایفیکٹس کے اعتبار سے وہ ایک ایسی فلم تھی جو وقت سے بہت پہلے بن گئی تھی۔ زیر آب مناظر کے حوالے سے وہ مجھے کیوبرک کی فلم ۲۰۰۱ کی یاد دلاتی تھی لیکن اس میں انسانی جذبات کی حدت بھی رچی ہوئی تھی۔ فلم کی بنیاد انسانوں اور ڈولفن مچھلیوں کے درمیان موجود بے حد قدیم تعلق تھا۔ بے حد عجیب لیکن جکڑ لینے والی کہانی تھی۔ بے حد مربوط سکرین پلے تھا اور اس پر پیش کرنے کا انداز۔ خود میری آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

اور وہ بالکل نئی چیز تھی۔ میں ۷۴ء سے اب چوتھی بار گزر رہا تھا۔ پچھلے تین موقعوں پر ۷۴ء میں فلم کا وجود نہیں تھا۔ ہوتا تو میں اس سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔

میں نے فلم کی کریڈٹ لسٹ پڑھی۔ وہ میرے لئے فلم سے زیادہ حیران کن تھی۔ ڈائریکٹر اسٹیون اسپیل برگ۔ مصنف اور پروڈیوسر پامیلا فلپس، تخلیقی مشیر اور سپیشل ایفیکٹس سپروائزر جارج لوکس۔

یہ کیسے ممکن ہے؟ اسپیل برگ کی پہلی بڑی فلم جاز تھی اور اس کی ابھی شوٹنگ بھی نہیں شروع ہوئی تھی اور جارج لوکس کو تو دو سال بعد سٹار وارز کے حوالے سے منظرِ عام پر آنا تھا۔ مگر سب سے بڑی الجھن تو یہ تھی کہ یہ پامیلا فلپس کون ہے؟ یہ کہاں سے آن ٹپکی اچانک؟

☆==========☆==========☆

"ایلن، مجھے اس سے غرض نہیں کہ تم یہ کام کیسے کرو گے؟" میں نے اپنے سٹاک بروکر سے کہا۔ "بس تمہیں اس ملاقات کا وقت لینا ہے اور یقینی طور پر اگلے ہفتے۔"

"آپ سمجھ نہیں رہے ہیں جناب! یہ کام اتنا آسان نہیں۔ اب ان لوگوں کے پاس دولت کی کمی نہیں۔ ہالی ووڈ کے بیشتر پروڈیوسر اور مصنف مس فلپس سے ملنے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔"

"مجھے اس کے ہاتھ کچھ فروخت نہیں کرنا ہے ایلن! میں بزنس مین ہوں، مووی

میکر نہیں۔"

دوسری طرف دیر تک خاموشی رہی۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ بروکر کیا سوچ رہا ہے۔ نو سال پہلے ایک بار ایسا ہوا تھا کہ میری اس سے براہ راست بات ہوئی تھی۔ یہ ۶۵ء کی بات تھی۔ میں نے اس کی فرم کے پاس ایک مخصوص رقم رکھوائی تھی اور اس کے بعد میں وقتاً فوقتاً اسے مختلف کمپنیوں میں بھاری سرمایہ کاری کرنے کی ہدایت دیتا رہا۔ ایسی فرمیں، جن کا کوئی چانس نہیں تھا۔

"اس وقت میرے سٹاکس کی مالیت کتنی ہے ایلن؟"

"سر، اس کا جواب میں یوں نہیں دے سکتا۔ بڑا پیچیدہ ہے آپ کا حساب۔ میرا خیال ہے، مجھے کئی دن لگیں گے۔"

"اندازاً بتا دو۔"

ایلن نے سرد آہ بھری۔ "کوئی ۶۵ ملین ڈالر کے اثاثے ہوں گے آپ کے۔ اس اندازے میں پانچ ملین تک کی کمی بیشی ہو سکتی ہے لیکن، مس فلپس کی کمپنی کو سرمائے سے دلچسپی نہیں۔"

"تو کسی اور زاویے سے کوشش کرو۔" میں نے کہا۔ "تمہارے جاننے والوں میں کوئی ایسا شخص نہیں جس کے فلمی دنیا میں گہرے روابط ہوں۔"

"مسٹر عباسی، میں جو کچھ کر سکا، ضرور کروں گا۔"

"جو کچھ کرنا ہو، جلدی کرنا۔ اتنے برسوں کے کاروباری تعلقات کے بعد مجھے اپنا اکاؤنٹ کہیں اور منتقل کرنا تکلیف دہ لگے گا۔"

☆==========☆==========☆

"مسٹر عباسی!" سیاہ بالوں والی ریسیپشنسٹ نے کہا۔ "اب مس فلپس آپ سے ملیں گی۔"

پامیلا فلپس کا آفس کسی فلمی پروڈیوسر کا دفتر ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا ماحول بہت سنجیدہ تھا۔ "گڈ مارننگ مسٹر عباسی، کچھ لیں گے آپ؟ کافی یا جوس؟"

"شکریہ مس فلپس۔" میں نے جواب دیا۔

"بس تو نتالی، تم جاؤ۔ شکریہ۔"

میں نے اس عورت کو غور سے دیکھا، جس سے ملاقات کی میں ایک ماہ سے کوشش کر رہا تھا۔ وہ دراز قد تھی .... کم از کم پانچ فٹ آٹھ انچ۔ اس کے گول خوبصورت چہرے پر بہت ہلکا میک اپ تھا۔ بال سنہرے تھے۔ اس کا لباس بھی سادہ تھا۔ کوئی جیولری بھی نہیں پہنے تھی وہ۔

"تشریف رکھئے مسٹر عباسی۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ سٹار سی پروڈکشنز میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں۔"

یعنی سیدھا سیدھا بزنس! یہ انداز ۷۴ء کا تو نہیں تھا۔ ہاں ۸۰ کی دہائی میں بزنس کرنے والی خواتین کا یہی انداز ہو جاتا تھا۔ "جی ہاں، میرے پاس کچھ سرمایہ............"

"میں ابتدا میں ہی واضح کر دوں کہ ہماری کمپنی کو باہر سے سرمائے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ایک دوست کی خاطر آپ کو ملاقات کا وقت دیا ہے لیکن آپ موشن پکچرز میں سرمایہ لگانا چاہتے ہیں تو میرے خیال میں آپ غلط جگہ چلے آئے ہیں۔ ہاں میرا وکیل آپ کو ایسی کمپنیوں کی لسٹ فراہم کر سکتا ہے، جو............"

"مجھے فلمی بزنس میں نہیں، صرف سٹار سی میں دلچسپی ہے۔"

"اگر کبھی ہماری کمپنی سرمائے کے لئے پبلک کے پاس گئی تو میں آپ کو ضرور مطلع کروں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ گویا گویا ملاقات ختم............

"آپ کو میری دلچسپی کے سلسلے میں تجسس ہی نہیں؟" میں بیٹھا رہا تھا۔

"جب سے فلم ریلیز ہوئی ہے، ہر طرح کے لوگ اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ مگر میں اس وقت کئی اور پروجیکٹس کے سلسلے میں مصروف ہوں۔ مائنڈ نہ کیجئے گا۔ میں بہت مصروف ہوں۔" اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

وہ میری توقع سے زیادہ مشکل ثابت ہو رہی تھی۔ اب میرے پاس جارحیت کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ "سٹار وارز کے متعلق کیا خیال ہے؟ تمہاری کمپنی اس میں حصے دار بنے گی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا۔ "مسٹر عباسی، ہر سنی ہوئی بات پر یقین نہ کیا کریں۔ فلمی دنیا میں افواہیں پھیلتی ہی رہتی ہیں۔"

"اور کلوز انکاؤنٹر کے بارے میں کیا کہتی ہو؟ میرے خیال میں ابھی تو خود اسپیل

برگ بھی اسے بنانے کی ہمت نہیں کرے گا۔"

اب اس کی نگاہوں میں برہمی کے علاوہ بھی کوئی چیز تھی۔ وہ بیٹھی مجھے گھورتی رہی۔

"تم نے یہ نام کہاں سے سن لیا؟"

میں اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ البتہ فلم ریڈرز آف دی لوسٹ آرک کا حوالہ دے ڈالا۔

اب وہ پوری طرح میری طرف متوجہ تھی۔ کچھ نروس بھی نظر آ رہی تھی اور اس کے چہرے پر استعجاب کے سوا کوئی تاثر نہیں تھا۔ "تم کون ہو؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا "کون ہو آخر تم؟"

"کمال ہے۔" میں مسکرایا۔ "یہی کچھ میں تمہارے متعلق سوچ رہا ہوں۔ یہی تجسس مجھے یہاں لے آیا ہے۔"

☆==========☆==========☆

ٹوپینگا کینین میں واقع پامیلا فلپس کا مکان بے حد الگ تھلگ تھا۔ وہ پانچ ایکڑ کے پلاٹ کے وسط میں بنا ہوا تھا۔ گرد و پیش خود رو جھاڑیوں، گھاس، لیموں کے درختوں اور انگوری بیلوں کا عجیب امتزاج تھا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ "اس کی چھٹائی کرا لینی چاہئے تمہیں۔" میں نے مشورہ دیا۔

"اگر مجھے رسمی گارڈن کی آرزو ہوتی تو میں بیورلی ہلز میں بھی مکان لے سکتی تھی" پامیلا نے سرد لہجے میں کہا۔

"یہاں کافی پھل ہے، جو تم ضائع کر رہی ہو۔"

"پھلوں کے لئے مارکیٹ بہت کافی ہے۔"

میں نے سوچا، جہنم میں جاؤ۔ تمہاری زمین ہے۔ جو چاہو کرو۔ میں اب بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ سوائے اس کے کہ میری طرح وہ بھی زندگی کو مسلسل ری پلے کر رہی ہے۔ اس نے اصرار کیا تھا کہ پہلے میں اپنی کہانی سناؤں۔ کہانی اس نے خاموشی سے سنی تھی۔ بس کبھی کبھی وہ مزید تفصیلات کا تقاضا کرتی رہی تھی۔ میں نے بھی بہت سی جزئیات حذف کر دی تھیں۔ شرلا کے متعلق میں نے ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا۔

مکان بہت اچھا فرنش کیا گیا تھا۔ آفس کی طرح وہاں بھی سادگی کا راج تھا۔ کھڑکی

کے پاس ایک بڑی ڈیسک تھی، جس پر کتابیں اور نوٹ بکس رکھی تھیں۔ میز کے بیچ میں سبز رنگ کی ایک بڑی ڈیوائس رکھی تھی۔ اس میں ایک کی بورڈ اور ایک پرنٹر تھا۔ ایک ویڈیو سکرین بھی اس سے منسلک تھی۔ میں نے اسے الجھن بھری نظروں سے دیکھا۔ ابھی سے کمپیوٹر کہاں سے..........

"یہ کمپیوٹر نہیں ہے۔" پامیلا نے بتایا۔ "۱۲۰۰ لفظوں کا وانگ پروسیسر ہے۔ اس میں ڈسک سسٹم نہیں۔ کیسٹ استعمال ہوتے ہیں۔ بہرحال ٹائپ رائٹر سے آگے کی چیز ہے۔ بیئر لو گے؟"

"ضرور۔" میں نے کہا۔ میں ابھی تک سحر زدہ سا تھا۔ یہ احساس بے حد خوش کن تھا کہ میں ایک ایسی عورت کے ساتھ ہوں، جس کے پاس میری طرح مستقبل کے حوالے ہیں۔ وہ بیئر مجھے دے کر کپڑے بدلنے کے لئے چلی گئی۔ میں اس کی کتابوں کا جائزہ لیتا رہا۔ لگتا تھا، اسے فکشن سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کتابوں میں زیادہ تر سوانح تھیں یا پھر فلم انڈسٹری کے متعلق معلوماتی کتب۔

وہ لباس تبدیل کر کے واپس آئی اور میرے سامنے آ بیٹھی۔ "اب مجھے جہاز کے اس حادثے کے بارے میں بتاؤ۔" وہ بولی۔ "اپنے دوسرے سائیکل کے اختتام کے قریب جب مجھے احساس ہوا کہ یہ چکر تیسری بار بھی چل سکتا ہے تو میں نے جہازوں کے حادثے، ریل کے حادثے، ہوٹلوں میں آتش زنی، زلزلے اور سیلاب کے تمام واقعات یاد کر لئے تھے۔ یہ حادثہ مجھے یاد نہیں۔"

"میں نے بھی سوچا تھا کہ یہ سب یاد کر لوں۔" میں نے کہا۔

"اب تک یاد کر لینا چاہئے تھا تمہیں۔ خیر.......... اب بتاؤ حادثے کے متعلق۔"

"سنو.......... یہ یکطرفہ معاملہ نہیں چلے گا۔ مجھے بھی تمہارے بارے میں اتنا ہی تجسس ہے۔"

"تم اپنی کہانی مکمل کر دو۔ پھر میری کہانی بھی سن لینا۔"

میں نے اسے حادثے کی تفصیل اور پھر دنیا سے کنارہ کشی کے نو برسوں کا حال سنایا۔ میں نے اسے زمین سے، فصلوں اور پھلوں سے اپنی محبت کے متعلق بتایا۔

"تمہارے سامنے آنے کے بعد سب کچھ بدل گیا ہے۔" وہ بولی۔ "مجھے توقع نہیں

تھی کہ مجھ جیسا کوئی اور بھی ہو گا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "تمہاری طرح میں بھی الجھی ہوئی ہوں۔ میں زندگی کو.......... اس چکر کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن تم تو ہتھیار ڈال بیٹھے ہو۔ دنیا ترک کر دی ہے تم نے۔"

"اور تم نے یہ فلم بنا دی ہے۔ یہ نہیں سوچا تم نے کہ اتنی بڑی تبدیلی کتنی تباہ کن ثابت ہو سکتی.........."

"مجھے یہ بتانے کی کوشش مت کرو کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں.........."

"میں تو صرف مشورہ دینا چاہ رہا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور ذرا سوچو موجودہ صورتِ حال میں کوئی اور تمہیں مشورہ دینے کا اہل بھی ہے۔"

اس کی برہمی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ "اس پر بعد میں بات کریں گے۔ تم میری کہانی سننا چاہتے ہو یا نہیں؟"

"تو اور یہاں آیا کس لئے ہوں میں۔"

☆==========☆==========☆

پامیلا فلپس ۴۹ء میں ویسٹ پورٹ، کنیکٹی کٹ میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا باپ ایک کامیاب سٹیٹ ایجنٹ تھا۔ اس کا بچپن اور لڑکپن عام سا تھا۔ وہی چھوٹی بیماریاں، وہی ننھی منی خوشیاں، وہی عام سے دکھ اور پچھتاوے۔ اس نے ہارڈ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ایک وکیل سے شادی کے بعد وہ نیو روشیل چلی گئی۔ اس کے دو بچے ہوئے.......... ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ وہ رومانوی ناول کثرت سے پڑھتی تھی۔ مصوری اس کی ہابی تھی۔ کبھی وقت ملتا تو رفاہی کاموں میں حصہ لیتی۔ اسے پچھتاوا تھا کہ اس نے کچھ کیا نہیں۔ کوئی کیریئر شروع نہ کر سکی اور وہ اکتوبر ۹۳ء میں ہارٹ اٹیک سے مر گئی تھی۔ ۴۴ سال کی عمر میں۔

"تاریخ بتا سکتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"وہی تمہاری والی تاریخ ۱۸ اکتوبر۔ بس وقت کا فرق ہے۔ میرا وقت ایک بج کر پندرہ منٹ پر پورا ہوا تھا۔"

"نو منٹ کا فرق ہے۔" میں مسکرایا۔ "تم مستقبل سے مجھ سے زیادہ واقف ہو۔"

اس بار وہ بھی مسکرا دی۔ "وہ بڑے بے زار کن نو منٹ تھے۔ موت کے نو

منٹ۔"

"پھر تم اس کے بعد کہاں جاگیں؟"

"اپنے گھر میں۔ وہاں ٹی وی پر مائی لٹل مارجی چل رہا تھا.......... اور میں ۱۴ سال کی تھی۔ ممی شاپنگ کرنے گئی ہوئی تھیں۔ ڈیڈی کام پر گئے ہوئے تھے۔ میں کوئی ایک گھنٹے تک چکرائی ہوئی اِدھر اُدھر پھرتی رہی پھر اس ڈائری کو پڑھتی رہی، جو کالج کی تعلیم کے عرصے میں کھو گئی تھی۔ پھر میں نے آئینہ دیکھا.......... اور روتی رہی۔ میں اس وقت بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ میں مر چکی ہوں اور خدا مجھے میرے ماضی کی جھلکیاں دکھا رہا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ دروازے سے نکلوں گی تو خود کو آسمان پر پاؤں گی۔ پھر میری ممی واپس آ گئیں۔ میں سمجھی، ان کے روپ میں کوئی فرشتہ مجھے اوپر لے جانے کے لئے آیا ہے۔ میں نے خوفزدہ ہو کر چیخنا شروع کر دیا۔ ممی مجھے چپ کرانے کی کوشش کرتی رہیں۔ پھر انہوں نے ڈاکٹر کو بلا لیا۔ اس نے انجکشن لگایا۔ میں بے ہوش ہو گئی۔ جاگی تو ڈیڈی میرے سرہانے کھڑے تھے۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔ تب مجھے احساس ہونا شروع ہوا کہ درحقیقت زندہ ہوں۔ سب کچھ ویسا ہی تھا، جیسا میں نے ۱۴ سال کی عمر میں دیکھا تھا۔ وہی پڑوس کے مکان، وہی پڑوسی، وہی برابر والوں کا کتا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ نہ جانے کیوں، میں پھر رونے لگی۔

"میں ایک ہفتہ گھر پر رہی۔ بیماری کا بہانہ کر کے سکول سے بچتی رہی۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہوا کیا ہے میرے ساتھ لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ دن گزرتے گئے اور سب کچھ ویسے کا ویسا رہا تو مجھے حوصلہ ہوا۔ میں نے اپنے لائحہ عمل پر غور کرنا شروع کیا۔ یہ ذہن میں رکھو کہ میرے سامنے تمہاری طرح کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں صرف ۱۴ سال کی تھی اور گھر پر رہتی تھی، جونیئر ہائی سکول میں پڑھتی تھی۔ نہ میں گھڑ دوڑ پر شرطیں لگا سکتی تھی، نہ تمہاری طرح پیرس جا سکتی تھی۔ یعنی میں بری طرح پھنسی ہوئی تھی۔"

"واقعی.......... خوفناک صورتِ حال تھی۔" میں نے ہمدردی سے کہا۔

"ہاں، لیکن کسی نہ کسی طرح میں نے سمجھوتہ کر ہی لیا۔ میں نے پچھلی زندگی کی سب باتیں بھلا دیں اور پھر سے کم عمر لڑکی بن گئی۔ البتہ اپنے بچے مجھے بہت یاد آتے

تھے.........." اس نے فرش پر نظریں جما دیں۔

مجھے اپنی حنا یاد آ گئی۔ میں نے دلاسہ دینے کے لئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ سمٹنے لگی۔ اس کے انداز میں ناگواری تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اٹھا لیا۔

"وقت گزرتا گیا تو وہ گزرے ہوئے برس خواب لگنے لگے۔" پامیلا نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "میں یوں تعلیم میں لگ گئی، جیسے وہ سب کچھ پہلی بار پڑھ رہی ہوں۔ البتہ اس بار مجھ میں شرمیلا پن آ گیا۔ میں کتابی کیڑا بن گئی۔ ہم عمر لڑکوں لڑکیوں سے بچنے لگی۔ میں پرانی یادوں کو بھلا دینا چاہتی تھی.........."

"تم نے کبھی کسی کو اس سلسلے میں کچھ بتایا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ابتدا میں ہی جو میں چیخی چلائی تھی .... میرے والدین مجھے ایک سائیکاٹرسٹ کے پاس لے گئے۔ چند سیشن گزارنے کے بعد وہ مجھے قابلِ اعتبار لگنے لگی۔ اس نے بڑی توجہ اور ہمدردی سے میری بات سنی لیکن میں جان گئی کہ وہ اس حقیقت کو میرا وہم سمجھ رہی ہے۔ پھر میں نے کینیڈی کے قتل سے ایک ہفتہ پہلے اسے اس قتل کے بارے میں بتایا۔ اس پر وہ بہت خفا ہوئی اور اس نے مجھے مزید وقت دینے سے انکار کر دیا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میری خود فریبی اتنی بڑی حقیقت کیسے بن گئی۔" پامیلا نے نظریں اٹھائیں اور مجھے بہت غور سے دیکھا۔ "لیکن اس واقعے نے خود مجھے بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ کینیڈی قتل ہوئے بلکہ اس لئے کہ میرے خیال میں .... بلکہ میں یقینی طور پر جانتی تھی کہ کینیڈی کے قاتل کا نام لی ہاروے اوسوالڈ ہے۔ میں نے تو نیلسن بینٹ کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ مجھے یہ تو اب معلوم ہوا ہے کہ وہ تمہاری مداخلت کا نتیجہ تھا۔ اس وقت تو یہ ہوا کہ مجھے اپنی یادداشت پر بھی اعتماد نہیں رہا۔ مجھے لگا کہ دنیا بدلی ہوئی ہے۔ ایسا کچھ بھی ہو سکتا ہے، جو پچھلی بار نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ میں بھی پچھلی بار کے مقابلے میں ایک بالکل مختلف شخصیت ثابت ہو سکتی ہوں۔

"میں بارڈ کے بجائے کولمبیا چلی گئی۔ اس بار میں نے بائیولوجی کا مضمون لیا اور پھر میڈیکل سکول میں چلی گئی۔ یہ مرحلہ میرے لئے سخت تھا کیونکہ مجھے کبھی سائنس سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ پچھلی بار میری دلچسپی فنون میں تھی لیکن فائدہ یہ ہوا کہ میں تعلیم

دہرانے کی بوریت سے بچ گئی۔ وہ بالکل نیا میدان تھا میرے لئے .... بالکل مختلف دنیا تھی۔

"میری سوشل لائف محدود تھی۔ پھر میں ایک ایسے آرتھو پیڈسٹ سے ملی، جو میرے شوہر سے بالکل مختلف تھا۔ طب ہمارے درمیان قدر مشترک تھی۔ ہم اس پر گھنٹوں باتیں کر سکتے تھے جبکہ پہلے .... اور اصل سائیکل میں، میں اپنے وکیل شوہر سے بات نہیں کر پاتی تھی۔ وہ بھی اپنے پروفیشن کے متعلق مجھ سے گفتگو کرنے سے بچتا تھا۔

"ڈیوڈ کا تعلق شکاگو سے تھا۔ میرے ہاؤس جاب مکمل کرتے ہی ہم شکاگو چلے گئے۔ وہاں میں نے چلڈرن میموریل ہاسپٹل کے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں کام کیا۔ میرے شوہر نے پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی تھی۔ اس بار میں بچوں سے محروم رہی .... میرے یہاں کئی بچے ہوئے لیکن کوئی بھی ایک ہفتے سے زیادہ نہیں جیا۔ مگر ہسپتال کے مریض بچے بھی میرے لئے اپنے بچوں کی طرح تھے۔ انہیں میری ضرورت تھی۔ بہرکیف وہ میرے لئے بے حد سکون بخش کیریئر تھا۔ میری محرومی دور ہو گئی تھی۔ مجھے بڑی آرزو تھی کیریئر کی"۔ اس نے چند لمحے توقف کیا۔ "پھر میں مر گئی .... اور ایک بار پھر جاگی تو ۱۴ سال کی تھی۔"

میں اس کے چہرے پر لکھی اذیت کی تحریر پڑھ رہا تھا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں اس کے دکھ کو سمجھتا ہوں .... میں نے کہا۔ "اب ہم وقفہ نہ کر لیں۔ کہیں باہر چلتے ہیں۔ کھانا کھائیں گے۔ کھانے کے بعد تم اپنی باقی کہانی مجھے سنانا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس کے لہجے میں تشکر تھا۔ "لیکن کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں گھر میں ہی کچھ پکا لوں گی۔" وہ بولی۔ "مجھے گھر کے کام اچھے لگتے ہیں۔"

"نہیں .... کھانا باہر ہی کھائیں گے۔"

☆==========☆==========☆

کھانے کے بعد پامیلا نے بات اپنی فلم سے شروع کی۔ "تمہیں اسٹار سی واقعی اچھی لگی یا وہ بس تمہیں مجھ تک پہنچانے کا بہانہ بنی؟"

"یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اس فلم نے عام لوگوں کی طرح مجھے بھی ہلا ڈالا۔ ہاں .... اس کے یوں اچانک نمودار ہونے پر مجھے شاک لگا تھا۔"

"اب تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ جب مجھے پتہ چلا ہو گا کہ کینیڈی کے قاتل کا نام نیلسن بینٹ ہے تو مجھ پر کیا گزری ہو گی۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"ایک بات بتاؤ۔ تم کوشش کے باوجود کینیڈی کو قتل ہونے سے کیوں نہیں بچا سکے؟"

"اس سلسلے میں دو امکانات ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک تو یہ کہ کینیڈی کے قتل کی سازش بہت بڑی تھی۔ منصوبہ بنانے والوں نے اچانک ہونے والی کسی گڑبڑ کے خیال سے ایک سے زیادہ قاتل لائن میں لگا رکھے تھے۔ اوسوالڈ مرکزی کردار تھا۔ اس کے علاوہ سٹینڈ بائی بھی ہوں گے۔ میرا خیال ہے، بینٹ کو کوئی واقعہ پیش آ جاتا تو کوئی اور قاتل کام دکھا جاتا۔ کینیڈی کو بہرحال قتل ہونا تھا اور دوسرا امکان میرے اور تمہارے نقطۂ نظر سے بہت زیادہ اہم ہے۔ وہ یہ کہ شاید ہم اپنی مستقبل کی معلومات کو تاریخ کا رخ بدلنے کے لئے استعمال نہیں کر سکتے اور میں اس پر یقین رکھتا ہوں۔"

"لیکن تم نے اتنی بڑی مالیاتی سلطنت بنا ڈالی تھی۔ تم ان بڑی بڑی کمپنیوں میں حصے دار .... بلکہ مالک بن گئے، جو پہلے ...."

"اس سے کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ "وہ کمپنیاں پہلے موجود تھیں۔ ان کی مصنوعات بھی وہی رہیں۔ ان کے کام کرنے والے بھی وہی رہے۔ البتہ ان کے منافع کا ایک حصہ میری طرف بہنے لگا۔ میری زندگی میں تبدیلی بہت بڑی آئی لیکن دنیا میں تو کچھ بھی نہیں بدلا۔ عام لوگوں کو تو میرے وجود کا پتہ بھی نہیں چلا.........."

"اور اسٹارسی کے متعلق کیا کہتے ہو؟" پامیلا نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی نے یہ فلم دیکھی ہے۔ میں نے اس کے ذریعے ایک نیا تصور روشناس کرایا ہے۔ انسان اور کائنات کے تعلق کی ایک نئی جہت متعارف کرائی ہے.........."

"تم سے ملنے کے لئے آنے سے پہلے میں نے اس فلم پر تمام تبصرے پڑھے ہیں۔ بلاشبہ یہ شاندار فلم ہے۔ اس پر مَیں تمہیں داد دیتا ہوں لیکن بہرحال وہ دو گھنٹے کی تفریح ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔"

پامیلا کی آنکھوں میں برہمی دہکنے لگی۔ اس کے پندار کو ٹھیس لگی تھی۔ "ایسی بات نہیں۔ یہ فلم ایک آغاز.........." وہ کہتے کہتے رک گئی۔ "خیر چھوڑو۔ میں بہرحال اپنی بے بسی کے بارے میں تمہاری رائے سے اختلاف رکھتی ہوں۔ اب یہ بتاؤ، میرے دوسرے ری پلے کے بارے میں سننا چاہتے ہو یا نہیں؟" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن ری پلے کے بارے میں ہمارے رویے مختلف ہیں۔" وہ بولی۔

"اس کے باوجود ہم کسی اور سے تو یہ باتیں نہیں کر سکتے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"دوسرے ری پلے میں، میں اپنے گھر میں نمودار ہوئی تو بہت ڈپریس تھی۔ وجہ تو مجھے معلوم نہیں تھی لیکن میں جان گئی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میرے اندر غصہ بھرا ہوا تھا۔ میں چیخنا چلانا، توڑ پھوڑ کرنا چاہتی تھی۔ غضب خدا کا اب میں پھر سے بچی تھی جو اپنے ارادے سے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے کچھ رقم چرائی اور گھر سے بھاگ گئی لیکن وہ بڑا خوفناک تجربہ تھا۔ کوئی مجھے اپارٹمنٹ دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں کہیں جاب بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس عمر میں کوئی لڑکی کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ میں سڑکوں پر آوارہ گردی کرتی رہی۔ بالآخر مجھے گھر واپس جانا پڑا۔ پھر سکول.......... وہاں کا ایک ایک پل مجھے بھاری لگ رہا تھا۔ سب کچھ پڑھا ہوا دوبارہ پڑھنا کوئی مذاق نہیں ہوتا۔ مجھے پھر اس سائیکاٹرسٹ کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس بار میں نے اسے ایک بات بھی نہیں

بتائی۔ پچھلی بار کا تجربہ بہت کافی تھا۔ پینٹنگ سے مجھے عشق تھا۔ چنانچہ اس بار میں نے اس کی طرف دھیان دیا۔ اس پاگل دنیا میں ہوش مند رہنے کے لئے یہی کچھ کر سکتی تھی میں۔ میرے والدین نے مجھے تمام ضروری چیزیں لا دیں۔ وہ خوش تھے کہ میں کچھ کر رہی ہوں۔ انہوں نے مجھے کنٹرول کرنے کی کوشش ترک کر دی تھی اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ میں اپنے فن پر توجہ دیتی اور محنت کرتی رہی۔

"سترہ سال کی عمر میں، میں سکول سے نکلی۔ ڈیڈی نے مجھے ایک آرٹ انسٹیٹیوٹ میں داخلہ دلا دیا۔ وہاں میں بہت کامیاب رہی۔ مگر میرے اندر کا ڈپریشن میرے فن میں سما گیا تھا۔ میری بنائی ہوئی تصویریں بے رحمانہ ہوتی تھیں۔ ان میں اداسی کے گہرے رنگ ہوتے تھے۔ بعض اوقات تو میری تصویریں لوگوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھیں۔

"میں بیس سال کی تھی تو نیویارک میں میری تصویروں کی نمائش ہوئی۔ وہیں میری ملاقات ڈسٹن سے ہوئی۔ اس نے میرے دو کینوس خریدے۔ گیلری بند ہونے کے بعد وہ مجھے ڈرنک کے لئے لے گیا.........."

"ڈسٹن؟"

"ہاں.......... اداکار ڈسٹن ہوف مین۔ اسے میرا کام بہت پسند آیا تھا۔ جبکہ میں اس کے فن کو سراہتی تھی۔ اس کی فلم مڈ نائٹ کاؤ بوائے اس سال ریلیز ہوئی تھی۔ میں نے خود کو قابو مین رکھا کہ کہیں فلم کریمر بمقابلہ کریمر یا ٹوٹسی کا حوالہ نہ دے بیٹھوں۔ یہ فلمیں ابھی ریلیز ہی نہیں ہوئی تھیں۔ بہرکیف ہم دونوں تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے۔ ایک سال بعد ہماری شادی ہوئی۔"

میں اپنی حیرت نہ چھپا سکا۔ "تم نے ڈسٹن ہوف مین سے شادی کی تھی؟"

"ہاں۔ وہ اچھا آدمی تھا.......... بے حد ذہین۔ اب وہ مجھے صرف رائٹر اور پروڈیوسر کی حیثیت سے جانتا ہے۔ اسے اندازہ بھی نہیں کہ اس نے وقت کی کسی اور لہر میں میرے ساتھ ازدواجی زندگی کے سات سال گزارے تھے۔ گزشتہ ماہ ایک پارٹی میں اس سے سامنا ہو گیا تھا۔ بہت عجیب لگتا ہے ایسے موقعوں پر۔ مجھے تو سب کچھ یاد ہے لیکن ڈسٹن کو تو کچھ معلوم بھی نہیں۔ بہرکیف ہماری ازدواجی زندگی بے حد خوشگوار تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ میں تصویریں بناتی رہی تھی۔ مجھے اس میں

کسی حد تک شہرت بھی ملی۔ مگر زیادہ نہیں۔ میرا مشہور کام "ذات کی بازگشت" اور "ماضی اور مستقبل" تھا.........."

"خدایا!" میں نے بے ساختہ کہا۔ "یہ دونوں تصویریں مجھے یاد ہیں۔ میں اپنے دوسرے ری پلے کی بیوی جوڈی کے ساتھ نیویارک گیا تھا۔ وہاں میں نے یہ تصویریں دیکھی تھیں۔ جوڈی کو بھی بہت پسند آئی تھیں۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں ان تصویروں پر کیوں مرمٹا ہوں۔ میں نے "ماضی اور مستقبل" تو خرید بھی لی تھی۔"

"خیر.......... وہ میرا آخری بڑا کام تھا۔ اس کے بعد جیسے میرے اندر تخلیق کا سوتا خشک ہو گیا۔" پامیلا نے اپنی بات جاری رکھی۔ "جانے کیوں۔ میں بہت سی باتوں کا اظہار کرنا چاہتی تھی لیکن شاید ڈرتی تھی یا شاید کینوس اس اظہار کے لئے موزوں نہیں تھا۔ بہرکیف ۷۵ء تک میں نے پینٹنگ کو خیرباد کہہ دیا۔ اسی سال میرے اور ڈسٹن کے درمیان علیحدگی ہو گئی۔

"شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں اس ری پلے کو نصف کے لگ بھگ گزار چکی تھی اور مجھے احساس تھا کہ جو کچھ بھی میں کروں گی، بالآخر وقت کا ڈسٹرا سے مٹا دے گا۔ بس پھر میں تتلی بن گئی۔ پوری دنیا میں اڑتی پھری۔ مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں رہی۔ میں بے راہرو بھی ہو گئی۔ مجھ پر بے زاری طاری ہو رہی تھی اور جب وقت قریب آ گیا تو میں نے ماجورکا میں چھوٹا سا الگ تھلگ مکان خرید لیا۔ متوقع موت سے ایک ماہ پہلے میں موت کا انتظار کرنے کے لئے وہاں پہنچ گئی۔ اس آخری مہینے میں، میں نے فیصلہ کیا کہ اب زندگی ملی تو میں سب کچھ بدلنے کی.......... دنیا پر اپنا نقش چھوڑنے کی کوشش کروں گی۔"

"وہ تو تم پہلے ری پلے میں ڈاکٹر کی حیثیت سے چھوڑ چکی تھیں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "جن بچوں کا تم نے علاج کیا.......... جنہیں محبت دی تھی۔ وہ اگلے ری پلے میں محروم رہ گئے۔ بدلا تو کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں۔ وہ سب کچھ بے معنی تھا۔ میں کوئی بڑا کام کرنا چاہتی ہوں۔ میں دنیا کو روشنی دینا چاہتی ہوں۔"

"مجھے یہ بتاؤ کہ فلم کیسے بنائی تم نے؟"

"یہ مشکل کام نہیں تھا۔ خاص طور پر اس لئے کہ سرمایہ میں خود لگا رہی تھی۔

سکول کے دنوں میں، میں اس کے لئے منصوبے بناتی رہی تھی۔ فلم بہت مؤثر ذریعہ ابلاغ ہے، جس کے ذریعے اپنی بات لوگوں تک پہنچائی جا سکتی ہے اور پچھلے ری پلے میں ڈسٹن کی وجہ سے میں فلمی دنیا سے خوب واقف ہو چکی تھی۔ سو اٹھارہ سال کی عمر میں، میں نے آئی بی ایم اور پولورائیڈ میں سرمایہ کاری کی .... تمہاری طرح۔ تم جانتے ہو، یہ وہ وقت تھا جب تین چار سال کے اندر چند ہزار ڈالر کے ملین ڈالرز بن سکتے تھے۔

"اسٹارسی کے سکرین پلے پر مجھے فخر ہے۔ سکرپٹ مکمل کرنے اور اپنی پروڈکشن کمپنی قائم کرنے کے بعد مجھے بس ہر کام کے لئے ماہر لوگوں کی خدمات حاصل کرنی تھیں اور میں ان لوگوں کو جانتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کی طاقت کہاں کہاں ہے اور وہ کمزور کس جگہ ہیں۔ چنانچہ سب کچھ میرے منصوبے کے مطابق ہوتا گیا۔"

"اور اب؟" میں نے پوچھا۔

"اب مجھے اگلا قدم اٹھانا ہے۔ دنیا کو جگانا ہے تاکہ لوگ اندھیروں کی جگہ روشنی بوئیں۔ میں یہ کام کر سکتی ہوں۔" وہ آگے کو جھک آئی اور مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ "ہم یہ کام مل کر بھی کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ.........."

☆==========☆==========☆

.... اور اب اس ملاقات کو ساڑھے تین سال ہو چکے تھے۔ وہ ایک سرد دن تھا۔ رات چھ انچ سے زیادہ برف باری ہوئی تھی۔ کچن کی کھڑکی باہر سے آدھی سے زیادہ برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میں کافی پیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ سہ پہر کو برف صاف کروں گا۔ اس کے علاوہ سٹور سے آتش دان کے لئے لکڑیاں بھی نکالنی تھیں لیکن اس وقت میرا کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے یادیں ستا رہی تھیں اور یادیں بھی اتنی مختلف، اتنی زیادہ تھیں کہ میں شل ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے حنا یاد آ رہی تھی، جوڈی یاد آ رہی تھی، دونوں لے پالک بچے یاد آ رہے تھے۔ ایک طوفان تھا، میں جس میں گھرا ہوا تھا۔

میں نے پلکیں جھپکائیں اور آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسوؤں کو لڑھکنے کا موقع دیا۔ آنسو پونچھتے ہوئے میں نے سوچا کہ خود کو مصروف رکھنے میں ہی عافیت ہے ورنہ یادیں تو جینا دوبھر کر دیں گی..........

دور سے مجھے کسی انجن کی سی آواز سنائی دی لیکن یہ ناممکن تھا۔ میں نے سر ایک

طرف جھکا کر سماعت پر زور دیا لیکن آواز واضح تھی۔ بلکہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس موسم میں کون آئے گا..........؟

میں نے پارکا پہن کر سر پر اونی ٹوپی رکھی اور باہر پورچ میں نکل آیا۔ چند لمحے بعد مجھے کیچڑ سے اٹی وہ لینڈ روور کھلے گیٹ سے لڑتی نظر آئی۔ ڈرائیور کے سنہرے بالوں پر نظر پڑتے ہی میں سمجھ گیا۔

پامیلا فلپس جیپ سے اتری۔ "گڈ مارننگ۔" اس نے کہا۔ "بڑا خوفناک راستہ ہے تمہارے گھر کا۔"

میں نے دل میں کہا .... میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے۔

"اس راستے پر ٹریفک کا گزر کم ہی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔" وہ بولی۔ "راستے میں مجھے ایک کار الٹی ہوئی نظر آئی تھی۔ لگتا ہے، خاصا پرانا حادثہ ہے اور سناؤ .... تم کیسے ہو؟"

"ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تمہارا کیا حال ہے؟"

"پچھلی ملاقات کے بعد سے مصروف بہت رہی ہوں۔ مائی گاڈ .... ساڑھے تین سال سے کچھ اوپر ہی ہو گئے ہمیں ملے۔ یہاں کوئی گرم جگہ نہیں ہے کیا؟"

"سوری۔ باتوں میں خیال ہی نہیں رہا۔ آؤ .... گرما گرم کافی بھی پلاؤں گا۔ بس بات اتنی سی ہے کہ تم نے مجھے حیران کر دیا ہے"۔

میں اسے اندر لے گیا۔ اس نے جیکٹ اتاری اور سٹوو کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے لئے پیالی میں کافی انڈیلی۔ کافی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے پوچھا "تم نے مجھے ڈھونڈ کیسے نکالا؟"

"میرے وکیل نے تمہارے بروکر سے رابطہ کیا تھا۔ اس نے مجھے ریڈنگ کے متعلق بتایا۔ ریڈنگ پہنچ کر میں نے مقامی لوگوں سے معلومات کیں۔ یہ مرحلہ خاصا دشوار ثابت ہوا۔"

"یہاں ایک دوسرے کی خلوت نشینی کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"خاص طور پر اجنبیوں کی اپنی زمین پر موجودگی کسی کو اچھی نہیں لگتی۔"

"اس کا مجھے اندازہ ہو گیا ہے لیکن میں تمہارے لئے اجنبی تو نہیں ہوں۔"

"تقریباً اجنبی ہی سمجھ لو۔ لاس اینجلس میں ہم جس طرح جدا ہوئے تھے.........."

"ہاں! مجھے یاد ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ہمارے درمیان ایک بہت بڑی قدر مشترک ہے لیکن ہم دونوں بالکل مختلف سمتوں سے آئے تھے۔ اس لئے.........."

"یوں کہو کہ تم بہت اڑیل ثابت ہوئیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

اس نے کافی کی پیالی میز پر رکھ دی۔ "یہ مت بھولو کہ میں چھ سو میل کا دشوار گزار سفر کر کے تم سے ملنے آئی ہوں۔ میری بات تو سن لو۔"

"سناؤ۔"

"دیکھو .... آج تم مجھے دیکھ کر حیران ہوئے ہونا!" اس نے دھیمے لہجے میں کہا "لیکن تم اس حیرت کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو تمہیں اس دن دیکھ کر مجھے ہوئی تھی۔ تم نے تو سٹارسی دیکھ کر میرے متعلق یقینی اندازہ لگا لیا تھا لیکن میرے لئے تو یہ بہت بڑا شاک تھا۔ میں خود کو تنہا اور .... منفرد سمجھتی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میں اس ری پلے کے سلسلے کو صحیح سمجھی ہوں اور جو کچھ کر رہی ہوں، ٹھیک کر رہی ہوں۔ تم آئے تو میں اپنی اگلی فلم کے سکرین پلے پر کام شروع کر چکی تھی۔ اکتوبر میں سکرپٹ مکمل ہو گیا۔ فنانس میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے ڈائریکشن کے لئے پیٹر ویٹری کی خدمات حاصل کیں۔ اس وقت تک اس نے دی لاسٹ ویو نہیں بنائی تھی۔ چنانچہ میرے اس انتخاب پر بڑی تنقید ہوئی۔" وہ مسکرائی۔ "سپیشل ایفیکٹس کے لئے میں نے پوری ٹیم بنائی۔ اس میں جان وکنی بھی تھا۔ وہ کمپیوٹر سے جنریٹ کئے جانے والے امیجز کے سلسلے میں کافی کام کر چکا تھا۔ میں نے اسے آزادانہ کام کرنے کی پیشکش کی۔ میں نے اسے پروٹو ٹائپ ابتدائی سپر کمپیوٹر بھی فراہم کئے۔ پھر میں نے ڈگلس ٹمبل کی خدمات حاصل کیں، جو فلم ۲۰۰۱ کے لئے کام کر چکا تھا۔ میں نے اسے غیر محسوس طور پر شو سکین کی طرف دھکیلا، جو اس کی ہی چند برس بعد کی ایجاد تھی۔ ہم نے پوری فلم اس پروسس کے تحت بنائی۔ حتیٰ کہ.........."

"ایک منٹ۔" میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "پہلے مجھے بتاؤ، یہ شو سکین ہے کیا بلا؟"

پامیلا حیران نظر آنے لگی۔ "تم نے کنٹی نیوم نہیں دیکھی۔"

"یہاں ریڈنگ میں ابھی تک ریلیز نہیں ہوئی ہے۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ اس علاقے میں اس فلم کی نمائش صرف سان فرانسسکو اور سکرانٹو میں ہوئی تھی۔ شو سکین بہت مؤثر چیز ہے لیکن اس کے لئے خصوصی پروجیکشن ایکوپمنٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ موشن پکچر کا کیا سسٹم ہوتا ہے۔ اس میں ایک سیکنڈ میں ۲۴ ساکت فریم ہوتے ہیں۔ ویڈیو ٹیپ زیادہ مؤثر ہے۔ اس لئے کہ اس میں ۳۰ فریم فی سیکنڈ ہوتے ہیں۔ انہی کی وجہ سے دیکھنے والے کو یہ بصری دھوکا ہوتا ہے کہ وہ بہتا ہوا تحرک دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ ایک فریم ختم ہوتا ہے تو دوسرا شروع ہوتا ہے تاکہ موشن نہ ٹوٹے۔ شو سکین اور آگے کی چیز ہے۔ اس میں ایک سیکنڈ میں ساٹھ فریم ہوتے ہیں۔ یہ تھری ڈی نہیں ہے لیکن اس کا تاثر اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس میں سب کچھ اصلی معلوم ہوتا ہے .... لائیو!

"بہرحال ہم نے پوری مووی شو سکین میں کی تھی۔ زیادہ تر عکس بندی لندن کے پائن ووڈ سٹوڈیوز میں کی گئی تھی۔ اداکار نہایت باصلاحیت لیکن غیر معروف تھے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی بڑے اداکار کی انا فلم کی تھیم پر .... اس کے پیغام پر اثرانداز ہو۔" پامیلا نے کافی کی دوسری پیالی خالی کر کے رکھی۔ "کنٹی نیوم ۱۱ جون کو ریلیز ہوئی اور بری طرح فلاپ ہوئی۔"

"کیا مطلب؟"

"فلم نے ایک ماہ تک اچھا بزنس کیا اور پھر اچانک ہی بیٹھ گئی۔ نقادوں اور تماش بینوں کو اس سے یکساں طور پر نفرت ہوئی۔ زبانی تبصرے تحریری تبصروں سے زیادہ زہریلے تھے۔ بیشتر لوگوں نے یہ فلم صرف شو سکین اور جدید ترین ٹیکنیکس کی وجہ سے دیکھی۔ اس کے سوا فلم میں کوئی اور چیز کسی کو پسند نہیں آئی۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے کہا۔ "مجھے افسوس ہوا یہ سن کر۔"

پامیلا تلخی سے ہنسی۔ "کتنی عجیب بات ہے۔ تم نے اس ڈر سے اس فلم کے پروجیکٹ میں میرا ساتھ نہیں دیا کہ یہ خوفناک تبدیلیوں کا سبب بن سکتی ہے۔ جبکہ پوری

دنیا نے اسے نظرانداز کر دیا۔"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ قدرت کا نظام ہے۔ ذہنی ارتقا ایک مرحلے وار .... بتدریج سفر ہے۔ اگر ہم پتھر کے زمانے میں چلے جائیں اور اس عہد کے لوگوں کو ایٹم کے بارے میں بتائیں تو کیا ہو گا؟ مذاق ہی اڑے گا ہمارا۔ پہلے ذہن بنتے ہیں .... آگے بڑھتے ہیں۔ پھر انسانیت کا ہراول دستہ کوئی نئی تھیوری پیش کرتا ہے۔ بیشتر لوگ اسے رد کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگ قبول کرتے ہیں اسے۔ تب آہستہ آہستہ وہ مروج ہو جاتا ہے۔ بہت لمبی جست قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ شیرخوار بچوں کو سائنس پڑھائی جائے گی تو یہی ہو گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" پامیلا نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے لئے ایک اذیت ناک تجربہ تھا لیکن میں نے اسے قبول کر لیا۔ مجھے اور تمہیں بہت کچھ قبول کرنا پڑتا ہے اور کرنا پڑے گا۔"

"لیکن میری نظروں میں تمہارا احترام بڑھ گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہاں .... یہ سچ ہے کہ ابھی تک ہم اس ری پلے کا مقصد نہیں سمجھ سکے ہیں۔ ہمارا کام اسی کو سمجھنا ہے۔ کچھ مقصد تو ہو گا اس کا۔"

"میں تمہاری شکرگزار ہوں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ قدرت نے ہمیں کسی مقصد سے ہی بار بار بھیجا ہے۔ ہمیں مل کر اسے دریافت کرنا چاہئے۔"

☆==========☆==========☆

"اور اگر ہم کہیں کسی بہت پرانے عہد میں اس طرح پھنس گئے ہوتے تو؟" پامیلا نے پوچھا۔

"زمانہ ماقبل تاریخ کا بھی عہد ایسا خوفناک نہیں، جیسا ہم سمجھتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے، دوسری جنگِ عظیم کا وقت ہوتا تو صحیح معنوں میں عذاب ہو جاتا۔"

"نہیں۔ وہاں بھی ہم بہت کچھ کر سکتے تھے۔"

اس بار یہ ہمارا پسندیدہ کھیل بن گیا تھا۔ ہم کوئی عہد چنتے اور تصور کرتے کہ اس میں ری پلے کرنا کیسا ہوتا۔ جب سے ہمارے درمیان گفتگو کے دروازے کھلے تھے، بات

کرنے کے لئے موضوعات کی کمی نہیں رہی تھی۔ وہ انوکھا تجربہ تھا۔ ہم دو ایسے افراد تھے، جن کے پاس یادوں کی کمی نہیں تھی اور دونوں ایک دوسرے کی یادوں میں دلچسپی بھی لیتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی سنتے، تبصرے کرتے اور ایک دوسرے کو مشورے دیتے۔ میرے اندر پہلی بار شکر گذاری جاگی تھی۔ خدا نے مجھ پر خاص کرم کیا تھا۔ بار بار کی اس تنہائی میں اس نے مجھے ایک ساتھی سے نوازا تھا، جو بالکل مجھ جیسا تھا۔

اس بات کو اب پانچ سال ہو چکے تھے کہ پامیلا مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اب ہم نے اپنے وقت کو تقسیم کر رکھا تھا۔ کبھی میں ٹوپینگا کینین میں اس کے گھر چلا جاتا۔ کبھی وہ میرے ہاں آ جاتی اور کبھی ہم نیویارک میں وقت گذارتے۔ ہمارے درمیان گفتگو کبھی ختم ہونے والی نہیں تھی۔ اب میں کچھ چھوٹی کمپنیوں میں اور ایسی مصنوعات کے لئے سرمایہ کاری کر رہا تھا، جو کبھی کامیاب ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں وافر سرمایہ میسر نہیں تھا۔ اب میں انہیں سرمایہ فراہم کر رہا تھا لیکن ان کی کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ رقم کی میرے لئے کوئی اہمیت نہیں تھی۔ البتہ یہ سسپنس میرے لئے بے حد خوش کن تھا کہ وہ کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس جانی پہچانی دنیا میں یہ بڑی بات تھی میرے لئے کہ مجھے کسی عمل کے انجام کا علم نہ ہو۔

دوسری طرف پامیلا پھر فلم میکنگ میں لگ گئی تھی۔ مگر اب اسے یہ خبط نہیں رہا تھا کہ اسے اس آرٹ کو آگے بڑھانا یا انسانیت کو کوئی پیغام دینا ہے۔ اب وہ اس سے لطف اٹھا رہی تھی۔ اس بار اس نے ایک رومینٹک کامیڈی فلم بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس بار بھی اس نے نئے اداکاروں اور ٹیکنیک کاروں کو متعارف کرایا تھا۔

وقت کا دھارا بہے جا رہا تھا!

☆==========☆==========☆

میں کافی کی پیالی ہاتھ میں لئے بیٹھا چٹانی ساحل کو دیکھ رہا تھا۔ سورج مغرب کے کنوئیں کی طرف تیزی سے جھکتا جا رہا تھا۔ پامیلا کھانا پکانے میں مصروف تھی۔

پہاڑ کے دامن میں واقع وہ چھوٹا سا مکان سٹیٹ ایجنٹ کے نزدیک وِلا کہلانے کا مستحق تھا لیکن درحقیقت و[illegible] چھوٹا تھا۔ میں جانتا تھا کہ پامیلا نے کیا سوچ کر اسے پسند

کیا ہے لیکن میں اس بارے میں سوچنے سے گریز کرتا تھا مگر حقائق سے کوئی کیسے نظریں چرا سکتا ہے۔ خیال تو ذہن کے کواڑوں کے پٹ پوری قوت سے دھکیل کر بھی اندر گھس سکتے ہیں۔

پامیلا کچن سے نکل آئی تھی اور مجھے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ میری آنکھوں کے تاثر کو پڑھنا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا۔ اس نے انگلی سے میرے رخسار کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”چلو........... کھانا کھا لو۔“

کھانے کے دوران خاموشی رہی۔ کھانے کے بعد میں برتن سمیٹنے میں مصروف ہو گیا لیکن میرے ذہن پر وہی ایک خیال چھایا ہوا تھا۔ بالآخر میں نے کہا۔ ”صبح میں چلا جاؤں گا۔ مجھے چھوڑنے جانے کی ضرورت نہیں۔ پالما تک میں بوٹ میں جاؤں گا۔ پھر ائرپورٹ کے لئے ٹیکسی کر لوں گا۔“

اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”دل تو نہیں چاہتا کہ تم جاؤ۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں خود بھی نہیں جانا چاہتا لیکن تمہیں اس مرحلے سے گذارنا بھی نہیں چاہتا۔“

”میں اس سے گزر سکتی ہوں۔“ اس نے محبت سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری خاطر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں اس موقع پر لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر میرا وقت پہلے آنا ہوتا تو میں کبھی یہ گوارا نہ کرتی کہ تم اس موقع پر موجود رہو۔ یعنی میں تمہارے محسوسات سمجھ سکتی ہوں اور ان کا احترام بھی کرتی ہوں۔“

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ بہرحال مرنے کے لئے وہ بے حد مناسب جگہ ہے۔ یہ وہ جگہ تھی، جہاں تیس برس پہلے پچھلے ری پلے میں پامیلا نے موت کو گلے لگایا تھا........... اور اب دو ہفتے بعد پھر...........

”تم کہاں جاؤ گے؟“ پامیلا نے پوچھا۔

”منٹگمری کریک۔“

ہم دونوں اپنی پہلی ملاقات کے بعد سے اب تک کی یادوں کو دہراتے رہے۔ بہرحال ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ بہت اچھا وقت گذارا تھا۔

”یاد رکھنا۔“ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”تمہیں پھر ملنا ہے۔ مجھے بھول نہ جانا۔“

"اب تمہارے سوا میں کچھ یاد رکھنا ہی نہیں چاہتی۔"

☆==========☆==========☆

میں کشتی میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ چوبی ڈوک پر کھڑی پامیلا چھوٹی ہوتے ہوتے نظروں سے معدوم ہو گئی۔ مکان بھی اب بس چھوٹا سا ایک نقطہ لگ رہا تھا۔ پھر وہ نقطہ بھی معدوم ہو گیا۔ کشتی میں سیاحوں کا ہجوم تھا۔ میں ایک طرف اکیلا بیٹھ گیا۔

میں خود کو یاد دلاتا رہا کہ کہانی ختم نہیں ہوئی۔ بس یہ ایک ری پلے اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ عنقریب میں اور پامیلا پھر یکجا ہوں گے۔ میں نے پامیلا کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا سب کچھ۔ اب ہم نئے سرے سے بہتر سٹارٹ لے سکتے تھے لیکن مجھے اس عہد سے .... اس سائیکل سے رخصت ہونا برا لگ رہا تھا۔ اس نے مجھے پامیلا سے ملوایا تھا۔ اس کی محبت کی نعمت دلوائی تھی مجھے۔

میں اور پامیلا اپنی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کرتے رہے تھے اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ وقت کی مختلف بیلٹس ہیں، جن پر ہماری زندگی کا سفر جاری تھا۔ اب اگلے ری پلے میں ہمیں مل کر بہت کچھ کرنا تھا۔

میں نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ چھوٹا سا چپٹا پیکٹ نکالا، جو پامیلا نے مجھے کشتی میں سوار ہوتے وقت دیا تھا۔ میں نے ٹشو پیپر کا ریپر کھولا۔ اندر جو چیز تھی، اسے دیکھ کر شدتِ جذبات سے میرا گلا رندھ گیا۔ وہ بہت چھوٹے سائز کی پینٹنگ تھی۔ وہ ماؤنٹ شاستا کا منظر تھا، جو میری جاگیر سے دکھائی دیتا تھا۔ پہاڑ کے اوپر فضا میں دو وجود تیرتے نظر آ رہے تھے۔ ان کے پر بھی تھے .... اور وہ میں تھا اور میرے ساتھ پامیلا تھی۔ یعنی وہ حقیقت تھی .... تخیل اور اسرار میں لپٹی ہوئی حقیقت۔

میں اس فن پارے کو محبت سے دیکھتا رہا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ صرف فن پارہ نہیں، اس میں لازوال محبت بھی گندھی ہوئی ہے۔ پھر میں نے اس پر دوبارہ ٹشو پیپر لپیٹا اور اسے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ کشتی اپنی منزل کی طرف بڑھتی رہی اور میں اپنی منزل کی طرف اور میری منزل موت تھی!

☆==========☆==========☆

میں نے آنکھیں کھولیں اور چاروں طرف دیکھا۔ سبز پردوں سے صبح کی نرم دھوپ

چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ مجھے اپنے پیروں پر بوجھ کا احساس ہوا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا۔ وہ سفید بلی تھی، جو میرے پیروں پر سر رکھ کر سوئی ہوئی تھی۔ میں ہلا تو اس نے بھی سر اٹھایا اور جماہی لی۔ پھر اس کی میاؤں میاؤں شروع ہو گئی۔

اب میں نے کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا .... اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ تو میرے، اپنے گھر کا کمرہ تھا۔ یعنی کوئی سنگین قسم کی گڑبڑ ہو گئی تھی ورنہ مجھے تو اپنے ہوسٹل کے کمرے میں بیدار ہونا تھا۔ ایک خیال نے مجھے لرزا دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس بار میں بچپن کے عہد تک جا پہنچا ہوں میں لپک کر باتھ روم میں گیا اور آئینہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اس بار بھی جوان ہی تھا۔ میں ڈرائنگ روم کی طرف گیا۔ وہاں امی بیٹھی نظر آئیں۔ وہ اخبار پڑھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر بولیں۔ "یہ تم اتنے سویرے کیسے اٹھ گئے؟"

"بس امی، ٹھیک طرح سے نیند نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ میں ان سے تاریخ اور سال نہیں پوچھ سکتا تھا۔ میں نے ان سے اخبار مانگ لیا۔ امی میرے لئے ناشتہ لانے چلی گئیں۔ میں نے اخبار میں تاریخ دیکھی۔ ۱۷ جولائی ۶۳ء یعنی موسم گرما کی چھٹیاں تھیں اور میں گھر آیا ہوا تھا۔ مگر .... مگر مجھے تو دو ماہ پہلے واپس آ جانا چاہئے تھا۔ دو ماہ کی تاخیر! وہاں پامیلا تو پاگل ہو رہی ہو گی۔ سوچ رہی ہو گی کہ میں نے اب تک اس سے رابطہ کیوں نہیں کیا ہے۔

جیسے تیسے میں نے ناشتہ کیا۔ پھر اچانک بولا۔ "امی .... مجھے فوراً واپس جانا چاہئے۔"

"کہاں؟ امریکا؟"

"جی امی .... مجھے ایک بہت اہم بات یاد آ گئی ہے..........."

"لڑکے .... کیسے باؤلے پن کی باتیں کر رہے ہو۔" امی نے تہدیدی لہجے میں کہا "تین دن بعد تو تمہیں ویسے ہی واپس جانا ہے۔ ایسا کون سا کام ہو سکتا ہے کہ تم تین دن بھی نہیں..........."

"سوری امی، مجھے خیال نہیں رہا تھا۔" میں نے سوچا، تین دن تو واقعی کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔

☆==========☆==========☆

رات میں نے ہوسٹل میں گذاری اور صبح سویرے ہی نکل کھڑا ہوا۔ اپنی پرانی گاڑی میں سفر کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ راستے میں رک کر میں نے ناشتہ کیا اور تھرماس میں بلیک کافی بھروائی۔ مجھے معلوم تھا کہ سفر بہت طویل ہے۔ اب میں جوان تھا۔ اس لئے اسے ایک دن میں نمٹا سکتا تھا۔ پرانا والا "میں" ہوتا تو دو دن سے کم نہ لگتے۔

نقشے کی مدد سے راستے کا تعین کرتے ہوئے میں ڈرائیو کرتا رہا۔ میں پریشان تھا۔ مجھے دو ماہ کی تاخیر ہو گئی تھی لیکن تاخیر کیوں ہوئی تھی؟ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور اس سلسلے میں پریشان ہونا بھی لاحاصل تھا۔ جس چیز پر اپنا اختیار نہ ہو، اس کا ہم کیا کر سکتے ہیں۔ پامیلا پریشان ہو گی مگر بہرحال اب میں اس سے جا ملوں گا۔

دوپہر کے قریب میں سوانا پہنچ گیا۔ وہاں پچھلے ہفتے نسلی فسادات ہوئے تھے۔ سڑکوں پر پولیس کی بھاری تعداد موجود تھی۔ بلوے کی نشانیاں جابجا نظر آ رہی تھیں۔

تین بجے کے ذرا بعد میں جنوبی کیرولینا میں فلورنس کے باہر ایک سینڈوچ کھانے کے لئے رکا اور اس کے فوراً بعد دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ میں ۷۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی دوڑا رہا تھا۔ رات کا کھانا میں نے رچمنڈ کے قریب ایک ٹرک سٹاپ پر کھایا۔ اب رات ہو چکی تھی اور اب تک میں نے آرام نہیں کیا تھا۔ مجھے اپنے سٹیمنا پر رشک آنے لگا۔ جارج واشنگٹن برج سے میں صبح چار بجے گزرا۔ اس وقت سڑک پر ٹریفک برائے نام بھی نہیں تھا۔

میں پامیلا کی پہلی اور اصل زندگی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ پامیلا، جسے میں نے نہ دیکھا تھا، نہ اسے جانتا تھا۔ اس پامیلا نے شادی کی تھی، اس کے بچے ہوئے تھے اور آخر میں وہ مر گئی تھی .... اس بات سے بے خبر کہ ابھی اسے یہاں کئی زندگیاں گذارنی ہیں .... اس بار .... ماجورکا میں موت پامیلا کے لئے کیسا تجربہ رہی ہو گی؟ میں اپنے تجربے کے تحت یہ امید ہی کر سکتا تھا کہ میری طرح اس بار وہ بھی پُرسکون رہی ہو گی۔ یہ سوچ کر کہ ہم ایک بار پھر یکجا ہوں گے .... اور وہ بھی طویل عرصے کے لئے لیکن کتنی ہی مختصر سہی، اس کی وقتِ نزع کی اذیت کا تصور کرنے کا حوصلہ مجھ میں اب بھی نہیں تھا۔ بہرکیف اب تو وہ وقت گزر چکا تھا۔

میں ویسٹ پورٹ پہنچا تو مشرقی افق پر صبح کا سپیدہ پھوٹ چکا تھا۔ ایک فون بوتھ میں ڈائریکٹری کی مدد سے میں نے اس کا پتہ اور فون نمبر نکالا لیکن ابھی بہت سویرا تھا۔ اس کے گھر جانے کے لئے یہ مناسب وقت نہیں تھا۔ میں ایک ڈے اینڈ نائٹ کافی شاپ میں جا بیٹھا اور محض وقت گذاری کے لئے نیویارک ٹائمز پہلے صفحے سے آخری صفحے تک چاٹ ڈالا۔ پھر میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سات بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ آٹھ بجے بھی جلدی ہی رہتا۔ اس وقت تک شاید وہ لوگ بیدار ہو چکے ہوں .... بلکہ ناشتہ کر رہے ہوں اور اگر اس دوران ہی میں پہنچ جاؤں تو؟ کیا فرق پڑے گا؟ ظاہر ہے، پامیلا مجھے دوست کی حیثیت سے متعارف کرائے گی اور پھر مجھے بھی ناشتے پر بٹھا لیا جائے گا۔

آٹھ بجنے میں بیس منٹ پر میں اٹھ گیا۔ کافی شاپ کے مالک سے میں نے نوٹ کیا ہوا پتہ سمجھا کہ کس طرح وہاں پہنچوں .... اور پھر کافی شاپ سے نکل آیا۔

وہ ایک عام سا دو منزلہ مکان تھا۔ میں نے اپنی ٹی شرٹ جینز کے اندر کرتے ہوئے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ مجھے لباس تبدیل کر لینا چاہئے تھا۔

"جی فرمایئے؟" دروازہ کھولنے والی عورت کے چہرے میں پامیلا کی غیر معمولی شباہت تھی۔ صرف ہیئر سٹائل مختلف تھا۔

"مام .... پامیلا فلپس موجود ہے نا؟"

"وہ ابھی سو کر نہیں اٹھی ہے۔" عورت نے جواب دیا۔ "تم اس کے سکول کے کوئی دوست ہو؟"

"جی .... سکول کا تو نہیں لیکن میں........."

"کون ہے بیتھ؟" اندر سے کسی مرد نے پوچھا۔ "ائرکنڈیشننگ والا تو نہیں ہے؟"

"نہیں ڈیئر! پام کا کوئی دوست آیا ہے۔" عورت نے پلٹ کر کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے ناوقت زحمت دی ہے۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن بہت ضروری کام تھا مجھے۔"

"میں دیکھتی ہوں۔ شاید وہ اٹھ گئی ہو۔"

"اجازت دیں تو میں اندر آ کر انتظار کر لوں۔ میں آپ کو زحمت تو نہیں دینا چاہتا

لیکن..........."

"ارے.......... تو اندر آکر بیٹھو نا۔"

میں اندر چلا گیا۔ وہاں ایک شخص آئینے کے سامنے کھڑا ٹائی کی گرہ لگا رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "تم پام کے دوست ہو؟"

"جی ہاں جناب۔"

"کیا پام کو تمہاری آمد کی توقع ہے؟"

"میرا یہی خیال ہے جناب۔"

"یہی خیال ہے سے کیا مراد ہے تمہاری۔ بغیر وقت طے کئے یوں اتنی صبح کسی سے ملنے چلے آنا.........."

"ڈیوڈ پلیز.........." خاتون نے اسے ٹوکا۔

"وہ میری منتظر ہو گی۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو اس نے کچھ نہیں بتایا۔ بیتھ، تمہیں اس نے بتایا تھا کہ کوئی اس سے ملنے کے لئے آنے والا ہے؟"

"مجھے تو یاد نہیں ڈیئر! لیکن ممکن ہے.........."

"تمہارا نام کیا ہے لڑکے؟"

یہ ایک اور مشکل مرحلہ تھا۔ پامیلا کے باپ کا انداز اچھا خاصا معاندانہ تھا۔ "ایفاک ایباس۔" میں نے بتایا۔

"یہ نام اگر کبھی پامیلا نے لیا ہوتا تو میں کبھی بھول نہیں سکتا تھا یہ عجیب نام۔"

"ڈیوڈ .... اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔" عورت نے کہا اور میری طرف مڑی "تم ناشتہ کر لو لڑکے۔ میں گرم کافی لاتی ہوں تمہارے لئے۔"

"شکریہ مام۔ ناشتہ میں کر چکا ہوں۔"

"تم پام کو کیسے جانتے ہو؟" پامیلا کے باپ نے مجھ سے پوچھا۔

میں اسے کیا بتاتا .... کیا کہتا .... لاس اینجلس سے؟ مجھے چکر سے آ گئے۔

ایک تو نیند سے محرومی اور پھر ڈرائیو کرنے کی تھکن۔ سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"میں نے پوچھا ہے، تم پام سے کہاں ملے تھے؟ تمہاری عمر زیادہ ہے۔ تم پام کے

کلاس فیلو تو نہیں ہو سکتے۔"

"ہم ایک دوست کے توسط سے ملے تھے .... ٹینس کلب میں۔" میں نے جواب گھڑا۔

"وہ دوست کون ہو سکتا ہے؟ پام کے ٹینس کلب کے تمام دوستوں سے تو میں واقف ہوں۔ اور.........."

"ڈیڈی .... میری سٹیمپ بک آپ کی کار میں تو نہیں رہ گئی؟" وہ سیڑھیوں پر کھڑی تھی۔ نوخیز لڑکی، پونی ٹیل باندھے ہوئے۔ بہت حسین اور معصوم لگ رہی تھی وہ۔

"نیچے آؤ پام۔ کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔" باپ نے اسے پکارا۔

وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتی نیچے آئی۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی تھیں۔

میں اسے دیکھ کر مسکرایا۔ جواباً وہ بھی مسکرائی۔ "تم اس لڑکے کو جانتی ہو پام؟"

وہ چند لمحے بغور مجھے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ "نہیں ڈیڈی۔"

"یہ کہہ رہا ہے کہ تم سے ٹینس کلب میں ملا تھا۔"

پامیلا نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں ڈیڈی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا۔" پھر وہ میری طرف مڑی "تم ڈینس دھٹ مائر کو جانتے ہو۔"

"ماجورکا، منگمری کریک، ماؤنٹ شاستا.........." میں نے بوکھلا کر سارے حوالے دے ڈالے۔

"سوری۔ میری سمجھ میں تمہاری کوئی بات نہیں آ رہی ہے۔"

"تم جو کوئی بھی ہو، اب چل دو یہاں سے۔" اس کے باپ نے خونخوار لہجے میں کہا۔

"پلیز پامیلا .... پامیلا پلیز.........." میں اب گڑگڑا رہا تھا۔ ڈیوڈ فلپس نے سختی سے میرا بازو پکڑا اور مجھے دروازے کی طرف گھسیٹنے لگا۔ "سنو لڑکے، مجھے نہیں معلوم کہ تمہارا کھیل کیا ہے لیکن اب میں نے تمہیں اپنے گھر کے قریب بھی دیکھا .... یا تم نے کہیں بھی میری پام کو تنگ کیا تو میں تمہارا برا حشر کروں گا۔"

"سر.......... یقین کیجئے، یہ ایک غلط فہمی ہے۔ میں زحمت کی معافی چاہتا ہوں لیکن

جناب، پامیلا مجھے جانتی ہے.........."

"میری بیٹی کے تمام جاننے والے اسے پام کہتے ہیں۔" مسٹر فلپس نے سرد لہجے میں کہا "اور تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ یہ صرف چودہ سال کی ہے۔ کم عمر لڑکیوں کو تنگ کرنا .... تم تو جانتے ہی ہو گے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں جناب۔ میں تو بس.........."

"تم میرے گھر سے فوراً نکل جاؤ ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گا۔"

"جناب، پامیلا کو بالآخر میں یاد آ جاؤں گا۔ میں اپنا نمبر چھوڑ جاتا ہوں.........."

"میں کہتا ہوں، تم فوراً نکل جاؤ یہاں سے.........."

"مجھے افسوس ہے جناب کہ ہم ایسی ناخوشگوار صورتِ حال میں ملے لیکن مجھے امید ہے کہ مستقبل میں.........."

مسٹر فلپس نے پوری قوت سے مجھے دھکا دیا۔ پھر دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔ اندر سے پامیلا کے رونے اور اس کی ماں کے اسے تسلی دینے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں چند لمحے بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ تھکن اور بڑھ گئی تھی۔

☆==========☆==========☆

اگست کا مہینہ بھی گزر چکا تھا۔ مجھ پر بیزاری اور کہولت مسلط تھی۔ پڑھائی کی طرف میں بالکل توجہ نہیں دے رہا تھا۔ ڈین کے آفس سے دھمکیاں مل رہی تھیں کہ مجھے کالج سے نکال دیا جائے گا۔ مگر میں نے انہیں نظرانداز کر دیا تھا۔ دوسری طرف پیسے کی کمی مسئلہ بن رہی تھی۔ ڈربی اور بیلمونٹ کی ریسیں نکل چکی تھیں۔ میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ فی الحال سامنے نہیں تھا۔ اکتوبر تک مجھے وقت گزاری کرنا تھی۔ پامیلا کو میں نے خط لکھا تھا، جس میں فون نمبر بھی دیا تھا لیکن اس کی طرف سے بھی کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

فرینک میڈوک سے اس بار ملاقات تک نہیں ہوئی تھی۔ جون میں وہ کالج سے فارغ ہو چکا تھا اور اب لاء سکول میں پڑھ رہا تھا۔ میں نے سینئر کلاس کے ایک اور سٹوڈنٹ کو گھیرا، جو شرط بازی کی لت میں مبتلا تھا۔ وہ بہت معمولی رقم کے عوض میری طرف سے ورلڈ سیریز پر شرط لگانے کو تیار ہو گیا۔ اتنی احمقانہ شرط میں حصے دار بننا اسے

گوارا نہیں تھا۔ میں نے دو ہزار ڈالر کے قریب شرط لگائی اور پونے دو لاکھ ڈالر جیتے۔ اب مجھے خاصے عرصے تک دولت کی پرواہ نہیں تھی۔ میں بوسٹن چلا گیا اور بیکن ہل میں ایک اپارٹمنٹ لے لیا۔ تاریخ اپنے راستے پر بہے جا رہی تھی۔ کینیڈی قتل ہو چکا تھا۔

مارچ میں، میں نے پامیلا کے گھر فون کیا۔ فون اس کی ماں نے ریسیو کیا۔ "ہیلو .... پلیز میری پام سے بات کرا دیجئے۔"

"کون بول رہا ہے؟"

"میں ایلن کوان ہوں۔" میں نے بڑی روانی سے نام بتایا۔ "اس کے سکول کا دوست۔" ایلن کا تذکرہ پچھلے ری پلے میں خود پامیلا نے کیا تھا۔

"ایک منٹ ہولڈ کرو۔"

میں بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ بالآخر ریسیور پر پامیلا کی آواز ابھری۔ "ایلن .... کیا بات ہے؟"

"پلیز پامیلا، ریسیور نہ رکھنا۔ میں ایلن نہیں ہوں لیکن مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"تم کون ہو؟"

"میں آفاق عباسی ہوں۔ یاد ہے، موسم گرما کی اس صبح میں تمہارے گھر آیا تھا.........."

"ہاں مجھے یاد ہے۔ ڈیڈی نے کہا تھا کہ مجھے تم سے بات نہیں کرنی ہے .... کبھی بھی نہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ تم انہیں بتانا ہی نہیں اس کال کے متعلق۔ مجھے تم سے پوچھنا ہے کہ تمہیں یاد آیا کچھ؟"

"کیا مطلب؟ کیا یاد آنا چاہئے مجھے؟"

"مثلاً لاس اینجلس۔"

"وہ میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ ڈیڈی اور ممی مجھے ڈزنی لینڈ لے کر گئے تھے.........."

"وہ نہیں۔ میں اور بات کر رہا ہوں .... ایک فلم کے متعلق، جس کا نام

سٹار سی تھا۔"

"یہ فلم تو میں نہیں دیکھی۔ مگر تم عجیب باتیں کرتے ہو۔ ڈر لگنے لگتا ہے کبھی کبھی۔ اچھا.......... اب میں ریسیور رکھ رہی ہوں۔"

"سنو .... میرا فون نمبر لکھ لو۔ نہ لکھنا چاہو تو یہ ذہن میں رکھنا کہ میں اب بوسٹن میں ہوں۔ ڈائریکٹری سے بھی تمہیں میرا نمبر مل سکتا ہے۔" میں نے اپنا فون نمبر دہرایا۔

"مجھے تمہارے فون نمبر کا کیا کرنا۔ تم واقعی کچھ کھسکے ہوئے ہو؟"

"ہاں۔ شاید ایسا ہی ہے۔ بس تم یاد رکھنا۔ تم کسی بھی وقت مجھے فون کر سکتی ہو۔ تمہیں سب کچھ یاد آ جائے گا بالآخر۔"

ریسیور رکھ کر میں اداس بیٹھ گیا۔ پامیلا کے لئے میں بالکل اجنبی ہو گیا تھا!

☆==========☆==========☆

اب میں تھا اور بنجر اور طویل برس! وہ جو ایک خوبصورت امید تھی کہ اب میں اپنے جیسی ایک شخصیت کے ساتھ وقت گزاروں گا اور بھری دنیا میں اکیلا نہیں ہوں گا، دم توڑ چکی تھی۔ پامیلا نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی اصلیت سے بے خبر تھی۔ فی الوقت تو وہ ایک معصوم بچی تھی اور اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ اسے سب کچھ یاد آ جائے گا۔

اب مجھے جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ آخر میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ کیا مقصد ہے اسے کا؟ اس سلسلے میں غور کرتے کرتے میں بیزار ہو گیا۔ کیونکہ کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ یہ تو بس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے مترادف تھا۔

میں پاکستان چلا گیا۔ میں ابو کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ انڈسٹری کو فروخت کر دیں لیکن وہ یہ بات مان ہی نہیں سکتے تھے۔ منافع مسلسل بڑھ رہا تھا اور ان کے خیال میں پاکستان تیزی سے صنعتی ملک بننے کے دور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جھنجلا کر میں نے ابو سے اس بات پر شرط لگا لی کہ اب زیادہ سے زیادہ نو برس میں ان سے سب کچھ چھین لیا جائے گا۔

۶۴ء میں، میں پاکستان سے واپس آ گیا۔ ابھی میرے اس ری پلے کے ۲۹ سال باقی

تھے اور میں ابھی سے بیزار ہو رہا تھا۔ اب میں کیا کروں؟ پھر منٹگمری کریک چلا جاؤں اور باقی زندگی وہیں گزار دوں؟ ممکن ہے، یہ میرا آخری ری پلے ہو .... جیسے شاید پامیلا کا پچھلا ری پلے آخری تھا۔ اس لئے تو اس بار اسے کچھ یاد نہیں۔

میں نے کاروبار کی طرف توجہ دی۔ مالی استحکام بہت ضروری تھا اور کچھ دشوار بھی نہیں تھا۔ مگر میری بیزاری دور نہیں ہوئی۔ ایک دن رات کو دیر سے میں اپنے اپارٹمنٹ پہنچا تو دروازہ کھولتے ہی اندر فرش پر ایک ٹیلی گرام پڑا نظر آیا۔ میں نے لفافہ چاک کیا۔ ٹیلی گرام پڑھ کر میری کوفت دور ہو گئی اور جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ لکھا تھا..........

"کہاں ہو تم؟ میں دن بھر فون پر تم سے بات کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ میں واپس آ گئی ہوں، واپس آ گئی ہوں۔ فوراً میرے پاس پہنچو۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہاری پامیلا۔"

میں نے ویسٹ میں اس کے گھر کے سامنے گاڑی روکی تو رات کے ساڑھے گیارہ بجنے والے تھے۔ چلنے سے پہلے میں نے فلائٹ کے بارے میں معلوم کیا تھا لیکن جلدی کی کوئی فلائٹ نہیں تھیں کار کے ذریعے میں زیادہ جلدی پہنچ سکتا تھا اور یہ فاصلہ میں نے ریکارڈ ٹائم میں طے کیا تھا۔

پامیلا کے باپ نے دروازہ کھولا اور مجھے ایک نظر میں اندازہ ہو گیا کہ یہ معاملہ آسان ثابت نہیں ہو گا۔ "میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ.........." اس نے بلا تمہید کہا ".......... میں اس ملاقات کی اجازت اپنی بیوی کے اصرار پر دے رہا ہوں اور میری بیوی کے اصرار کی وجہ پام کی دھمکیاں تھیں کہ اگر اسے تم سے بات کرنے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔"

"مجھے افسوس ہے مسٹر فلپس کہ یہ اتنا بڑا تنازعہ بن گیا۔" میں نے بے حد خلوص سے کہا۔ "میں نے پچھلی ملاقات میں بھی کہا تھا کہ میں آپ لوگوں کے لئے مسئلہ نہیں کھڑا کرنا چاہتا۔ یہ سب غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے، یہ دہرایا نہیں جائے گا۔ میں اپنے وکیل سے بات کر چکا ہوں۔ آج کے بعد میری بیٹی کی عمر اٹھارہ سال ہونے تک تم اس کے قریب دیکھے گئے تو گرفتار کرا دیئے جاؤ گے۔ اب جو کچھ تمہیں اس سے کہنا ہے، آج ہی کہہ دو۔ سمجھ گئے؟"

"جناب، آپ بس مجھے پامیلا سے ملوا دیں۔ یقین کریں، آپ کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو گا۔"

"اندر آ جاؤ۔ پام نشست گاہ میں موجود ہے۔ تمہیں ایک گھنٹے کا وقت دیا گیا ہے۔"

پامیلا کی ماں کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ یقینی طور پر روتی رہی تھی۔ پندرہ سالہ پامیلا صوفے پر اس کے برابر بیٹھی ہوئی تھی اور بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔

"ہیلو!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا پھر سٹار سی بنانی ہے؟"

وہ بڑوں کے انداز میں ہنسنے لگی۔ "ممی .... ڈیڈی، یہ میرا عزیز دوست ہے .... آفاق عباسی۔ آپ لوگ پہلے بھی مل چکے ہیں۔"

"میں حیران ہوں کہ تم نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا کہ تم اس لڑکے کو جانتی ہو۔" مسٹر فلپس کے لہجے میں حیرت تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو دیکھ بھی حیرت سے رہے تھے، جو راتوں رات اپنی عمر سے بڑی ہو گئی تھی۔

"میری یادداشت میں خلل پڑ گیا تھا شاید۔ بہرحال آپ نے وعدہ کیا ہے کہ ہمیں تنہائی میں بات کرنے کے لئے ایک گھنٹہ دیں گے۔ اب اپنا وعدہ پورا کریں پلیز........"

"گھر سے نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔" مسٹر فلپس ہم دونوں سے مخاطب تھے۔ "بلکہ نشست گاہ سے نکلنے کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔"

مسز فلپس بھی ہچکچاتے ہوئے اٹھیں۔ "میں اور تمہارے ڈیڈی سٹڈی میں موجود رہیں گے۔ ضرورت پڑے تو بلا لینا۔" انہوں نے پامیلا سے کہا۔

"شکریہ ممی!"

اس کے ماں باپ کمرے سے نکلے تو .. بے تابی سے مری باہوں میں سما گئی۔ "پامیلا .... تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ کیا لڑ.. ہو گئی تھی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔ میں ماجورکا میں مقررہ وقت پر پچھلے ری پلے سے رخصت ہو گئی تھی لیکن نیا ری پلے آج صبح ہی شروع ہوا ہے۔ جب مجھے پتہ چلا کہ یہ کون سا سال ہے تو مجھے بھی شاک لگا۔"

"اس بار مجھے بھی تاخیر ہو گئی تھی لیکن صرف دو ماہ کی۔" میں نے اسے بتایا۔ "میں

ایک سال سے زیادہ عرصے سے تمہارا منتظر ہوں۔"

اس نے بڑی محبت سے میرے چہرے کو چھوا۔ "میں جانتی ہوں۔ ممی اور ڈیڈی نے مجھے بتایا ہے کہ تم آئے تھے........"

"تو تمہیں کچھ یاد نہیں؟" میں نے پوچھا اور پھر خود ہی جواب بھی دے دیا۔ "ظاہر ہے، کیسے یاد ہو گا؟ پھر تم نے مجھے بوسٹن میں ڈھونڈ کیسے نکالا؟"

"میں نے اپنی چیزیں ٹٹولیں۔ ایک کاغذ پر تمہارا نام اور بوسٹن کا فون نمبر لکھا مل گیا۔ وہ میں نے ری پلے سے پہلے شاید بے دھیانی میں لکھ لیا ہو گا۔ میں تمہارے نمبر کو ٹرائی کرتی رہی۔ پھر ٹیلی فون والوں سے تمہارا پتہ معلوم کر لیا اور تمہیں ٹیلی گرام کر دیا۔" وہ کہتے کہتے رکی اور پھر متاسفانہ لہجے میں بولی۔ "میں نے تمہیں پہچاننے سے انکار کیا ہو گا تو تم پر کیا گزری ہو گی۔"

"پریشان تو ہوا تھا میں لیکن اس بات کی خوشی بھی ہوئی تھی کہ تمہیں ۱۴ سالہ پامیلا کے روپ میں دیکھنے کا موقع مل گیا۔"

"پام!" باہر سے مسٹر فلپس نے پکارا۔ "تم ٹھیک تو ہو؟"

"آپ بالکل فکر نہ کریں ڈیڈی۔"

"اب تمہارے ۴۵ منٹ باقی رہ گئے ہیں۔"

"ایک مسئلہ ہے۔" میں نے فکرمندی سے کہا۔ "تم کم عمر ہو۔ تمہارے والد نے دھمکی دی ہے کہ میں تم سے ملا تو گرفتار کر لیا جاؤں گا۔"

"میں جانتی ہوں۔ اس میں کچھ قصور میرا بھی ہے۔ میں نے سہ پہر کو انہیں بتا دیا تھا کہ میں تمہاری کال کا انتظار کر رہی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم خود آ جاؤ۔ تمہارا نام سنتے ہی ڈیڈی آپے سے باہر ہو گئے۔ میں بھی خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ میں نے ایسی زبان استعمال کی جس کی انہیں امید نہیں تھی۔ اب اس کے نتیجے میں ہمیں کڑا وقت گزارنا پڑے گا۔ قانونی طور پر میں ابھی ڈیڈی کی ذمے داری ہوں۔"

"اور اگر ہم کہیں بھاگ جائیں........"

"پکڑے گئے تو تم بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔" پامیلا نے میری بات کاٹ دی۔

"جیل بھیج دیا جاؤں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے لئے ایک نیا تجربہ ہو گا۔"

"تم بھول رہے ہو کہ ۶۴ء میں کسی کم عمر لڑکی کو بھگانا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو، تو اب ہم کیا کریں گے؟"

"انتظار کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔ اب مجھے فرماں بردار بیٹی کا کردار ادا کرنا ہو گا۔ شاید اسی طرح سختی کچھ کم ہو جائے۔"

"خدایا .... میں تو پہلے ہی ڈیڑھ سال کی قیدِ تنہائی بھگت چکا ہوں .... تمہارے بغیر........"

"اور ہم کچھ کر بھی تو نہیں سکتے۔ دیکھو، یہ سب کچھ میرے لئے اور زیادہ تکلیف دہ ہے۔ مجھے تو ابھی سکول میں پڑھنا ہے۔ تم بتاؤ تم کیا کرو گے اب؟"

"میں بوسٹن واپس چلا جاؤں گا۔ بوسٹن یہاں سے قریب بھی ہے۔ میں وہاں سیٹل ہو چکا ہوں۔ اب میں سرگرم ہو جاؤں گا تاکہ جب ہم ملیں تو پیسے کا کوئی مسئلہ نہ ہو۔" میں نے کہا پھر اچانک پوچھا۔ "میں تمہیں فون تو کر سکتا ہوں......... خط تو لکھ سکتا ہوں؟"

"یہاں نہیں۔ میں کوئی پوسٹ باکس لے لوں گی خط و کتابت کے لئے اور جب بھی موقع ملا، تمہیں فون کر لیا کروں گی۔"

☆==========☆==========☆

پامیلا کی ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ اس کے اچھے رویے کی وجہ سے مسٹر فلپس نے ایک سال بعد ہمیں ملنے کی اجازت دے دی تھی۔ ہفتے میں ایک دن ہم فلم دیکھنے جا سکتے تھے لیکن ہم پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ مسٹر اور مسز فلپس نے مجھے قبول کر لیا تھا بلکہ وہ کسی حد تک مجھے پسند بھی کرنے لگے تھے۔

اور اب ہماری آزادی کا دن آ گیا تھا۔ پامیلا کے سکول کے جلسہ تقسیم اسناد میں مسٹر اور مسز فلپس کے ساتھ میں بھی موجود تھا۔ پامیلا نے تالیوں کی گونج میں سند وصول کی اور ہماری طرف چلی آئی۔ اس کے ماں باپ نے اسے مبارک باد دی۔ اس روز ہماری شادی ہو گئی، اب ہمیں رخصت ہونا تھا۔

"تم لوگوں کا فوراً ہی روانہ ہونا ضروری ہے کیا؟" اس کی ماں نے کہا۔

"ممی......... ہماری سیٹیں ریزرو ہیں۔" پامیلا نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، وہ شیئرز پکڑے رہوں۔" مسٹر فلپس نے مجھ سے پوچھا۔ وہ شیئرز انہوں نے میرے مشورے سے خریدے تھے۔

"جی ہاں، میرا مشورہ تو یہی ہے۔ دس بارہ سال میں ان کی قیمت کہیں کی کہیں جا پہنچے گی۔ اس منافع کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے، جو آپ کو ملے گا۔"

"تم لوگ پاکستان کتنے عرصے رکو گے؟" مسز فلپس نے پامیلا سے پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا ممی!"

دونوں نے آبدیدہ ہو کر ہمیں رخصت کیا۔

ہم نیویارک سے کراچی کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس بار گھر واپس جانا مجھے سب سے زیادہ خوشگوار لگ رہا تھا۔ میں گھر والوں کے لئے ایک آئیڈیل بہو لے کر جا رہا تھا۔ پامیلا میں وہ سب کچھ موجود تھا، جو ایک مشرقی لڑکی میں ہوتا ہے۔ اسے گھرداری کا، کھانے پکانے کا شوق تھا۔ اس میں حیا بھی تھی اور اس بار اس نے امریکہ میں رہتے ہوئے بھی مشرقی لڑکیوں کی طرح زندگی گزاری تھی۔

اور امی، ابو اور کوثر پامیلا پر فدا ہو گئے۔ پامیلا نے برضا و رغبت اسلام قبول کیا۔ اس کا نام عائشہ رکھا گیا۔ پھر دھوم دھام سے ہماری شادی کی گئی۔ یوں بالآخر وہ رات آ گئی، جس کا میں نے پانچ برس انتظار کیا تھا۔

عائشہ مشرقی لڑکیوں ہی کی طرح شرما رہی تھی۔ پھر جب حجاب اٹھ گئے تو اس نے ایک اعتراف کیا۔ "مجھے یقین ہے آفاق کہ بالآخر تمہارے مذہب سے مجھے عشق ہو جائے گا۔" وہ بولی۔ "مجھے علم نہیں تھا کہ پاک دامنی کتنی مسرت خیز ہوتی ہے۔ آج پہلی بار مجھے خود پر فخر محسوس ہو رہا ہے۔ میں نے صحیح معنوں میں اپنا سب کچھ تمہیں سونپ دیا ہے۔"

"میں بھی بہت خوش ہوں" میں نے کہا۔

اور واقعی، ہمارے لئے سچی خوشیوں کے دروازے کھل گئے تھے۔ وہ خود غرض خوشیاں نہیں تھیں۔ امی، ابو اور کوثر ہم سے زیادہ خوش تھے۔ کوثر تو عائشہ کا سایہ بن کر

رہ گئی تھی۔ امی عائشہ کی تربیت میں لگی رہتی تھیں۔ وہ اسے قرآن شریف پڑھاتیں، نماز کے بارے میں بتاتیں، پاکستانی کھانے پکانے تو انہوں نے اسے چند دن میں سکھا دیئے۔ نماز بھی وہ پانچوں وقت کی پڑھنے لگی۔

ایک رات میں نے کہا۔ "عائشہ .... مجھے تو لگتا ہے کہ میں پہلی بار زندگی گزار رہا ہوں۔"

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "مگر ہمیں اب ایک اہم موضوع پر بات کر لینی چاہیئے۔"

میں سنبھل کر بیٹھ گیا "تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟"

"اس بار میرا ری پلے اتنا لیٹ کیوں شروع ہوا۔ ڈیڑھ سال کا فرق پڑ گیا ہے اس بار۔"

یہ واقعی ایک قابلِ غور مسئلہ تھا۔ ہمارے درمیان اس پر بات نہیں ہوئی تھی۔

"ہاں، یہ تو ہے۔" میں نے کہا "لیکن اس کیوں کا جواب کہاں سے ملے گا؟"

"سوچنا تو چاہیئے نا۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ابھی بہت عرصہ پڑا ہے۔ ابھی سے اس کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تبادلۂ خیال نہ کرنے سے کیا فرق پڑے گا۔ یہ فکر تو اندر موجود رہے گی پھر بھی۔"

"ہاں، ٹھیک کہہ رہی ہو مگر اس کیوں کا جواب........."

"چلو .... وجہ معلوم نہ ہو لیکن یہ تو حقیقت ہے کہ کائنات ریاضی کے اصولوں پر چل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورج ہر روز اپنے مقررہ وقت پر نکلتا اور غروب ہوتا ہے۔ سیارے اپنی مقررہ رفتار سے اپنے طے شدہ راستے پر گردش کرتے ہیں۔ انسان نے یہ سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ ہم یہ اندازہ تو لگا سکتے ہیں کہ آئندہ ری پلے میں ہم کتنا لیٹ ہوں گے۔"

"واقعی .... یہ تو ہے، مگر یہ یاد کرنا ہو گا کہ اب تک کس حساب سے فرق پڑ رہا ہے" میں نے پُر خیال لہجے میں کہا۔

"یاد کرو۔ اپنے دوسرے ری پلے میں تم اپنے ہوسٹل کے کمرے میں نہیں تھے بلکہ

کار میں تھے .... جوڈی کے ساتھ۔"

"لیکن تاریخ وہی تھی .... پہلے ری پلے والی۔"

"پھر بھی .... آٹھ نو گھنٹے کا فرق تو پڑا ہی ہو گا۔ میں پہلی بار آئی تو دوپہر کا وقت تھا۔ دوسری بار آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ میرا خیال ہے، تیرہ چودہ گھنٹے کا فرق پڑ گیا تھا۔"

میں اس کی بات پر غور کر رہا تھا۔ "یہ تو ہم نے فرض کر لیا ہے کہ دوسری بار بھی وہی تاریخ تھی۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے، دنوں کا فرق پڑا ہو۔ کیونکہ دوسری بار حنا سے جدائی کے صدمے نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ کئی دن تک مجھے اپنا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ ضروری تو نہیں کہ وہی دن اور تاریخ رہی ہو .... پہلے ری پلے والی۔"

عائشہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں نے بھی تاریخ پر توجہ نہیں دی تھی۔ مگر مجھے یاد پڑتا ہے کہ دوسری بار میں ویک اینڈ پر واپس آئی تھی۔ جبکہ پہلے ری پلے کا دن مجھے یاد ہے۔ وہ منگل تھا اور اپریل کی آخری تاریخ۔ اس کا مطلب ہے کہ پہلی اور دوسری بار میں چار پانچ دن کا فرق پڑ گیا تھا۔"

"تو پھر تمہارے معاملے میں تیسری بار چار پانچ دنوں کا فرق ڈیڑھ سال کا کیسے بن گیا؟" میں نے اعتراض کیا۔

"یہی تو سمجھنا ہے ہمیں۔ وجہ تو ہم معلوم نہیں کر سکتے لیکن آئندہ کے ٹائم ٹیبل کو سمجھنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں۔ دیکھو .... سیکوینس کے سوال ہوتے ہیں نا۔ ۲، ۸، ۳۲، اب ۳۲ کے بعد کیا آئے گا؟"

"چار گُنے کا سیکوینس چل رہا ہے تو ۱۲۸ آئے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"بالکل یہی بات ہے۔ ہمیں اسی طرح حساب لگانا ہو گا۔ اگرچہ ہمارے پاس درست معلومات نہیں ہیں۔"

"پھر تمہارے اور میرے فرق کی رفتار بھی مختلف ہے۔"

ہم بہت دیر تک اس میں سر کھپاتے رہے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ اتنا اندازہ ہو گیا کہ اگلے ری پلے میں زیادہ طویل عرصے ایک دوسرے سے بچھڑے رہیں گے اور یہ بہت اُداس کن خیال تھا۔

"ممکن ہے، کسی اور نے اس فرق کا باقاعدہ حساب رکھا ہو۔ درست معلومات کے بغیر تو ہم حتمی طور پر فیصلہ نہیں کرسکتے۔" اچانک عائشہ نے کہا۔

میں بری طرح چونکا۔ "کسی اور سے کیا مراد ہے تمہاری؟"

"دیکھو .... میں نے اور تم نے تو اتفاقیہ طور پر ایک دوسرے کو دریافت کیا تھا .... فلم سٹارسی کے ذریعے۔ ممکن ہے، ہم جیسے اور لوگ بھی ہوں۔"

"ایسا ہوتا تو اب تک معلوم نہ ہو جاتا ہمیں؟"

"ضروری تو نہیں۔ سٹارسی نہ بنتی تو تم مجھ تک کیسے پہنچتے۔ نہیں آفاق .... ہمیں ایسے لوگوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرنا ہوگی۔"

"کہہ تو ٹھیک رہی ہو تم لیکن کیسے؟"

"اس کے لئے ہمیں امریکہ واپس جانا ہوگا۔" اس نے کہا اور مجھے ترکیب بتائی۔

"تو بہتر یہ ہے کہ پہلے یہاں کوشش کرلیں۔" میں نے کہا۔

☆==========☆==========☆

ملک کے تمام اخبارات اور رسائل میں ایک عام سا اشتہار چھپا تھا۔ غیر متعلقہ افراد کے لئے وہ بے معنی اور مہمل تھا۔ صرف ہمارے مطلوبہ اشخاص ہی اسے کوئی اہمیت دے سکتے تھے۔ مضمون کچھ یوں تھا۔

"کیا آپ پاکستان قومی اتحاد سے واقف ہیں؟ واٹرگیٹ سکینڈل کے متعلق علم ہے آپ کو؟ فلم فرسٹ بلڈ دیکھی ہے آپ نے؟ روس کی ٹوٹ پھوٹ یاد ہے آپ کو؟ اگر ایسا ہے تو آپ کے لئے خوشخبری ہے۔ آپ اکیلے نہیں ہیں۔ پوسٹ باکس نمبر ۱۹۹۳ پر ہم سے فوری طور پر رابطہ کریں۔"

یہ اشتہار مہینوں باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا لیکن کہیں سے کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ اس دوران ہم نے کوثر کی شادی کردی تھی۔ وہ اپنے گھر ہنسی خوشی رہ رہی تھی۔ پھر ۷۳ء میں، میں نے ابو سے شرط جیت لی لیکن مجھے ملا کچھ نہیں۔ ابو کی انڈسٹری قومیالی گئی۔ مگر صورتِ حال ابتر نہیں ہوئی۔ میں نے ایک بینک میں اکاؤنٹ کھول کر ابو کے لئے ہر ماہ مناسب رقم کی فراہمی کا بندوبست کیا اور ابو اور امی سے "قسمت آزمائی" کے لئے امریکہ جانے کی اجازت لے لی۔

امریکہ پہنچتے ہی ہم نے دو سو سے زائد ایسے اخبارات اور رسائل میں ہر روز اپنے اشتہار کی اشاعت کا بندوبست کیا، جو دنیا بھر میں پڑھے جاتے تھے۔ اب ہم پھر کسی ردِعمل کے منتظر تھے۔ اس بار جواب بے حساب آئے اور ایک مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ عائشہ نے لفافہ کھولا اور مجھے خط دکھایا۔ اس کے ساتھ ایک ڈالر کا نوٹ منسلک تھا۔ "یہ لوگ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ بیچ رہے ہیں؟"

"اس لئے کہ بیشتر لوگ کچھ بیچنے ہی کی کوشش کرتے ہیں اشتہارات کے ذریعے۔" میں نے جواب دیا۔ "اور اس سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ تر لوگوں کے خیال میں ہم کسی نوع کا کوئی مقابلہ کرا رہے ہیں۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"اگر ہم نے احتیاط نہ برتی تو پوسٹل اتھارٹیز سے تنازع ہو سکتا ہے۔ ہمیں لوگوں کے ارسال کردہ نوٹ واپس بھیجنے ہوں گے .... اس وضاحت کے ساتھ کہ ہمارا اشتہار کسی طرح کا سٹنٹ نہیں ہے۔ دیکھو نا، کسی نے پوسٹ آفس والوں سے شکایت کردی تو خواہ مخواہ کی مصیبت ہوگی۔"

"لیکن ہم نے کسی سے کچھ نہیں مانگا۔" عائشہ نے احتجاج کیا۔

"اس کے باوجود ہم پوسٹ آفس والوں کو کیسے سمجھائیں گے کہ یہ واٹرگیٹ سکینڈل کیا چیز ہے اور روس میں ٹوٹ پھوٹ کب ہوئی وغیرہ وغیرہ۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" عائشہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا پھر اس نے ایک اور لفافہ کھولا اور خط کا مضمون پڑھ کر ہنسنے لگی۔ "یہ اور لو۔ موصوف لکھتے ہیں .... مجھے اپنی یادداشت بہتر بنانے کے تربیتی کورس کے سلسلے میں مزید مواد بھجوایئے۔ مجھے ان میں سے کوئی بات یاد نہیں، جن کا حوالہ آپ کے اشتہار میں دیا گیا ہے۔"

مجھے بھی ہنسی آگئی۔ مجھے خوشی تھی کہ اس معاملے میں عائشہ کی حسِ ظرافت ابھی زندہ ہے۔ میں جانتا تھا کہ یہ جستجو اس کے لئے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے ری پلے میں پڑنے والا فرق میرے مقابلے میں بہت زیادہ تھا۔ امکان یہی تھا کہ آئندہ ری پلے میں وہ فرق بڑھ جائے گا۔ ڈر یہ تھا .... اسے بھی اور مجھے بھی کہ فرق خوفناک حد تک نہ بڑھ جائے۔ مجھے تو یہ خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو، اگلی بار وہ آئے ہی نہیں۔

گذشتہ چار ماہ میں ہمیں اشتہار کے سینکڑوں جواب موصول ہوئے تھے۔ بیشتر نے تو یہ سمجھا تھا کہ ہم کچھ فروخت کرنا چاہتے ہیں یا اسے کسی صلاحیت کا مقابلہ تصور کیا تھا۔

پھر ایک روز سڈنی سے ایک جواب موصول ہوا .... یک سطری پیغام۔ اس پر نہ کسی کے دستخط تھے نہ کوئی پتہ۔ لکھا تھا .... اس بار نہیں، انتظار کرو۔ یہ اور پاگل کر دینے والا جواب تھا۔ اس لئے کہ جواب سے اندازہ مثبت ہوتا تھا لیکن حاصل کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر لکھنے والا بھی ری پلے کر رہا تھا تو وہ موجودہ ری پلے میں ہم سے رابطہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور کون جانے۔

میں اب صورتِ حال سے مایوس ہو چکا تھا۔ کوشش ضروری تھی .... اور وہ ہم نے بہترین انداز میں کی تھی لیکن نتیجہ ہماری توقع کے مطابق نہیں نکلا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دنیا میں ہم جیسا ہم دونوں کے سوا کوئی ہو ہی نہیں۔ کم از کم مجھے تو اس بات کا یقین ہو چکا تھا۔

اس روز میں ڈاک لے کر بیٹھا اور احمقانہ جوابات کو ایک طرف پھینکتا رہا۔ اس خط کو بھی میں ایک طرف پھینکنا چاہتا تھا لیکن پہلی ہی سطر نے مجھے روک دیا۔ میں نے بڑی بے یقینی سے وہ مختصر سا خط پڑھا۔ ساتھ ہی مجھے بے اندازہ خوشی ہو رہی تھی۔ لکھا تھا............

”ڈیئر تم جو کوئی بھی ہو، تم بہت سی اہم باتوں کا تذکرہ کرنا بھول گئے مثلاً، شاہ ایران رضا شاہ پہلوی کا زوال، اس کی سرطان سے موت، انور سادات کا قتل اور ضیاء الحق کا قتل۔ یہ تو سب جاننے والے جانتے ہیں۔ گفتگو کرنی ہو تو مجھ سے ملنے چلے آؤ، اسٹیوارٹ میکملن۔“

میں دستخط اور پتے کو دیکھتا رہا۔ لفافے پر ڈاک خانے کی مہر پتے کی تصدیق کر رہی تھی۔ میں نے لفافہ اور خط عائشہ کی طرف بڑھا دیا۔

☆==========☆==========☆

ہم کراس فیلڈ کی حدود میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ہلکی برف باری شروع ہو گئی۔ میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ عائشہ نروس سی میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ ”کیا تمہارے خیال میں دنیا میں یہی ایک شخص ہو گا؟“ اس نے پوچھا۔

”ممکن ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ایک بھی ہے تو کیا ہوا۔ اس سے بھی بہت مدد مل سکتی ہے۔“

”اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی اور چکر ہو۔“

”اس کا تو زیادہ امکان نہیں۔ بہرحال ہم اتنا کچھ دیکھ چکے ہیں کہ ناممکن کی تو گنجائش ہی نہیں نکلتی۔ اس لئے کہ سب سے زیادہ ناممکن تو ہم خود ہیں۔“

”پتہ نہیں، مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔“ عائشہ بولی۔ ”اور ہم نے اسے مطلع بھی نہیں کیا ہے۔“

”مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارا منتظر ہو گا، تم فکر نہ کرو۔“

”یہ اسٹراتھ مور ہے۔“ عائشہ نے بائیں جانب بل کھاتی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ میں اس وقت تک گاڑی آگے لے جا چکا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ میں نے یو ٹرن کر کے گاڑی کو واپس لیا اور اسے بائیں جانب موڑ لیا۔ چند ہی منٹ بعد ہم ۳۸۲، اسٹراتھ مور کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ وکٹورین طرز کی تین منزلہ عمارت تھی .... الگ تھلگ۔ دیواریں بہت اونچی تھیں۔ میں نے گاڑی موڑ کر گیٹ سے گذار دی۔

کشادہ پورٹیکو میں گاڑی کھڑی کر کے ہم نیچے اتر آئے۔ داخلی دروازے پر پہنچ کر میں نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ عائشہ بہت زیادہ نروس ہو رہی تھی۔

ایک معمر عورت نے دروازہ کھولا۔ ”جی فرمائیے؟“

”مسٹر میکملن موجود ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”مسٹر........؟ کیا نام لیا آپ نے؟“

”مسٹر میکملن، اسٹیوارٹ میکملن۔ وہ یہیں رہتے ہیں نا؟“

”اوہ........ اسٹیوارٹ۔ جی ہاں........ جی ہاں........ ملاقات کے لئے وقت لیا ہے آپ نے؟“

”نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے منتظر ہوں گے۔ آپ انہیں بتا دیں کہ ان کے نیویارک والے دوست آئے ہیں۔“

”دوست؟“ عورت سوچ میں پڑ گئی۔ ”تم اسٹیوارٹ کے دوست ہو؟“

”جی ہاں، اور نیویارک میں رہتے ہیں ہم۔“

"میرا خیال ہے .... خیر چھوڑیں۔ آپ اندر آ جائیں۔ سردی بہت ہے۔ کچھ دیر اندر بیٹھیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

میں اور عائشہ ہال میں صوفے پر بیٹھ گئے۔ عورت ہمیں بٹھا کر چلی گئی۔ "یہ تو میرے خیال میں پورا گروپ ہے اور یہ مکان بھی اسٹیوارٹ کا نہیں۔" عائشہ نے سرگوشی میں کہا۔ "کیونکہ عورت اس کے صرف پہلے نام سے واقف ہے۔ میکملن کو نہیں جانتی وہ اور مجھے تو یہ کسی طرح کا ہوم معلوم ہوتا ہے۔"

اسی وقت سفید بالوں والا ایک دراز قد شخص ہماری طرف چلا آیا۔ دروازہ کھولنے والی عورت اس کے عقب میں تھی۔ "آپ لوگ اسٹیوارٹ میکملن کے دوست ہیں؟" مرد نے پوچھا۔

"جی .... جی ہاں۔ ہمارے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی ہے۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"خط و کتابت کا آغاز کس کی طرف سے ہوا تھا؟"

"بات سنیں۔ ہم مسٹر میکملن کی دعوت پر نیویارک سے آئے ہیں۔ آپ صرف اتنا کریں کہ مسٹر میکملن کو مطلع کر.........."

"آپ کی اسٹیوارٹ سے خط و کتابت کی نوعیت کیا تھی؟"

"آپ اسٹیوارٹ ہی سے پوچھ لیجئے گا۔ مجھے اندازہ نہیں کہ آپ کا ان امور سے کیا تعلق.........."

"اسٹیوارٹ سے متعلق ہر بات سے میرا تعلق ہے۔" دراز قد شخص نے کہا۔ "اس کی دیکھ بھال میری ذمے داری ہے۔"

میں نے عائشہ کو اور عائشہ نے مجھے دیکھا۔ "دیکھ بھال سے کیا مراد ہے آپ کی؟" میں نے پوچھا۔ "آپ ڈاکٹر ہیں، اور کیا اسٹیوارٹ بیمار ہے؟"

"جی ہاں .... اور اس کی بیماری سنگین بھی ہے۔ آپ اس کیس میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں؟ جرنلسٹ ہیں آپ؟ دیکھیں .... میں اخبارات کی بے جا مداخلت برداشت نہیں کروں گا.........."

"نہیں۔ ہمارا کسی اخبار یا رسالے سے کوئی تعلق نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا

اور اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ میری ساتھی ہیں عائشہ۔" میں نے کہا۔

اس کے چہرے سے کشیدگی اور کھنچاؤ دور ہونے لگا۔ "آئی ایم سوری مسٹر عباسی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ کاروباری معاملہ ہے.........." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ یہ اندازہ اس نے میرے کارڈ کی وجہ سے قائم کیا تھا۔ "میں ڈاکٹر جوئیل فیفر ہوں۔ یہاں ہم بڑی رازداری سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے.........."

"تو یہ اسٹیوارٹ میکملن کا گھر نہیں، کوئی ہسپتال ہے؟"

"معالجہ مرکز کہہ لیں۔"

"کیا عارضہ قلب کا معاملہ ہے یہ؟"

ڈاکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ "تو آپ اس کے بیک گراؤنڈ سے واقف نہیں ہیں؟"

"نہیں۔ ہمارا ان سے واحد تعلق سرمایہ کاری کے حوالے سے ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں سرمایہ کاری کے سلسلے میں مشورے دیتا ہوں۔"

ڈاکٹر اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ "اسٹیوارٹ کا حال کچھ بھی سہی لیکن مارکیٹ کی بڑی سمجھ ہے اسے۔ میں اس سلسلے میں اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ اب اس کا منافع ایک ٹرسٹ میں چلا جاتا ہے لیکن شاید کسی دن .... اگر وہ اسی طرح بہتر ہوتا رہا.........."

مجھے شاک سا لگا۔ "ڈاکٹر .... کیا یہ دماغی امراض کا ہسپتال ہے؟"

"ہسپتال نہیں۔ یہ پرائیویٹ سائیکاٹرک یونٹ ہے۔"

خدا کی پناہ! میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ اسٹیوارٹ مستقبل کے بارے میں بہت زیادہ باتیں کرتا ہو گا۔ ایسے آدمی کو لوگ پاگل ہی کہیں گے۔ میں نے عائشہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی انداز میں سوچ رہی تھی۔ ہمیں بہت محتاط رہنا تھا ورنہ ہم بھی پاگل قرار دیئے جا سکتے تھے۔

ڈاکٹر نے ہماری نگاہوں کے تبادلے کا کچھ اور ہی مطلب لیا۔ "اس کے پاگل پن سے نہ گھبرائیں۔ مالی معاملات میں وہ جینئس ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمیں اسٹیوارٹ سے ملوا دیں۔" عائشہ نے کہا۔

"ضرور!" ڈاکٹر نے کہا۔ پھر وہ عورت کی طرف مڑا۔ "میری .... اسٹیوارٹ کو سٹنگ روم میں لے آؤ۔"

☆==========☆==========☆

سٹنگ روم بہت آراستہ و پیراستہ تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔ "کون کہہ سکتا ہے کہ یہ............"

ڈاکٹر مسکرایا۔ "ہم نے یہاں کے ماحول کو نارمل رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں آپ کو کھڑکیوں میں سلاخیں بھی نظر نہیں آئیں گی۔ سٹاف کے لئے یونیفارم بھی نہیں ہے۔ یوں مریض جلدی صحت یاب ہو سکتے ہیں۔"

"اسٹیوارٹ کی کیا صورتِ حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں آنے کے بعد سے اس کی پروگریس شاندار رہی ہے لیکن اس کے معاملے میں قانونی پیچیدگیاں بھی ہیں............"

اسی لمحے ایک جوان شخص کمرے میں آیا۔ اس کی عمر ۳۰ اور ۳۵ کے درمیان تھی۔ اس کے پیچھے جینز اور جیکٹ پہنے ہوئے ایک تنومند جوان تھا۔ "اسٹیوارٹ .... یہ تمہارے غیر متوقع مہمان ہیں۔" ڈاکٹر نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بزنس سے تعلق ہے ان کا۔ نیویارک سے آئے ہیں۔ مسٹر اور مسز آفاق عباسی۔"

اسٹیوارٹ نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "میں بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے زحمت کی۔"

"اب آپ لوگ بات کریں۔" ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن عدالت کے حکم کے مطابق یہ مائیک یہاں موجود رہے گا۔ بس رسمی بات ہے۔ یہ آپ کو ڈسٹرب نہیں کرے گا۔"

تنومند جوان کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ اسٹیوارٹ ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔ "اب بتاؤ............" میں نے کہا۔

"میں تو بعد میں بتاؤں گا۔" اسٹیوارٹ نے کہا۔ "پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ صرف علم نجوم سے استفادہ کرتے ہو یا پیش بینی کی صلاحیت بھی ہے تمہارے پاس؟"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے جلدی سے عائشہ کی طرف دیکھا کہ وہ بولنے میں جلد بازی نہ کر بیٹھے۔ "میں نجومی ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر میں تمہارے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔"

"میرے پاس دونوں صلاحیتیں ہیں۔ یہاں میں اپنے بڑبولے پن کی وجہ سے پھنسا ہوں۔" اسٹیوارٹ نے کہا۔ "نااہل اور قدر ناشناس لوگوں کو مستقبل کا حال بتانے کا یہی صلہ ملنا تھا۔"

اسٹیوارٹ میکملن کی کہانی بے حد عام سی تھی۔ وہ علم نجوم کا ماہر بھی تھا اور سائیکک بھی تھا۔ لہٰذا خود کو نمایاں کرنے کے لئے پیش گوئیاں بھی کرتا رہتا تھا۔ اپنی صلاحیت سے اس نے بھرپور مالی فائدہ اٹھایا تھا۔ اسی لئے وہ اس پرائیویٹ ہوم میں تھا ورنہ اس وقت وہ کسی عام پاگل خانے میں ہوتا۔

ہمارے لئے وہ کہانی بے حد مایوس کن تھی۔ ہم تو کچھ اور آس لے کر آئے تھے۔ بلکہ میرا تو خیال تھا کہ وہ سچ مچ بھی کچھ کھسکا ہوا ہے۔ اس کے اصرار پر ہم نے اس سے وعدہ کیا کہ اس کی جان چھڑانے کے لئے کوشش کریں گے۔ رخصت ہوتے وقت ہم نے ڈاکٹر سے بات کی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اس کے خیال میں اسٹیوارٹ کو دو سال کے اندر اندر رہائی مل جائے گی۔

بالآخر ہم مایوس و دل گرفتہ وہاں سے نکل آئے۔

اس کے بعد ہم نے اپنے اشتہار کی اشاعت روک دی۔ عائشہ کا دل امریکہ سے بھر گیا تھا۔ ہم پھر پاکستان چلے آئے۔ وہاں ایک خوشگوار اور نارمل زندگی ہماری منتظر تھی۔ ہم خوش رہے۔ ابو اور امی کی زندگی تک ہم ان کے ساتھ رہے۔ کوثر سے بھی ہمارا رابطہ تھا۔ وہ بھی ہنسی خوشی رہ رہی تھی۔

پہلی بار مجھے احساس ہُوا تھا کہ محبت کتنی بڑی نعمت ہے۔ عائشہ کی محبت میرے لئے بہت بڑا سرمایہ تھی۔ مجھے یقین تھا کہ عائشہ بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتی ہے۔ اس کے باوجود ہمیں کوئی نامعلوم حِس ستاتی تھی۔ کوئی کمی محسوس ہوتی تھی زندگی میں۔ سب کچھ میسر تھا، پھر بھی ہم مکمل طمانیت سے محروم تھے۔

۹۰ء میں ہم پاکستان کی سیاحت کی غرض سے نکلے۔ شمال مغربی علاقوں نے عائشہ کا دل جیت لیا۔ مجھے بھی وہ سرسبز علاقہ بہت پسند آیا، جہاں غربت کے سوا سب کچھ اچھا ہی اچھا تھا۔ خاموشی اور سکون سے مرنے کے لئے وہ بہت اچھی جگہ تھی۔ میں نے مانسہرہ سے کچھ دور تھوڑی زمین لی اور اپنے لئے ایک کاٹیج بنوالیا۔

اکتوبر ۹۳ء میں ہمیں وہاں منتقل ہو جانا تھا۔

وقت آیا تو اس بار عائشہ نے مجھ سے جدا ہونا گوارا نہیں کیا۔ "بیوی ہونے کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے کہ میں ان لمحوں میں تمہارے پاس رہوں۔" اس نے کہا۔

یوں اس بار ۱۸ اکتوبر کو ایک بج کر چھ منٹ پر میں اکیلا نہیں تھا، بلکہ عائشہ کی بانہوں میں تھا اور مجھے فکر یہ تھی کہ اپنی اذیت کے ان لمحوں میں وہ اکیلی ہو گی۔ مگر وقت آیا تو اس پریشانی سمیت کچھ بھی نہ رہا۔ میں خاموش اندھیروں میں اتر گیا۔

☆==========☆==========☆

پہلا احساس یہ ہوا تھا کہ میں بہت چمکدار روشنیوں اور پُرشور ماحول میں ہوں۔ اِدھر اُدھر ہیولے نظر آئے۔ کوئی کھڑا تھا، کوئی بیٹھا تھا، کوئی رقص کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں کسی یخ بستہ مشروب کا گلاس تھا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میرا ہاتھ لرز رہا ہے۔ میں نے مشروب کا گھونٹ لیا، وہ نمکین تھا۔

"واہ۔" کوئی میرے کان کے پاس منہ کر کے چلّایا "کیا نظارہ ہے، ہے نا؟"

میں نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ میرا ہوسٹل کا روم میٹ مارٹن بیلے تھا۔ پھر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ بہت بڑا کمرہ تھا۔ وہ کوئی بار تھا یا نائٹ کلب۔ ڈانس فلور کے ساتھ ہی بینڈ والے بیٹھے تھے۔ وہ زرق برق لباس پہنے ہوئے تھے۔ چھت سے عجیب طرح کے فانوس جھول رہے تھے .... بیل کی شکلوں والے فانوس۔

میں ذہن پر زور دیتا رہا۔ بالآخر مجھے یاد آ گیا۔ وہ ۶۴ء کے کرسمس کی چھٹیاں تھیں، جو میں نے اور مارٹن نے میکسیکو میں گذاری تھیں۔ اب میں یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کون سی رات .... کون سی تاریخ ہے۔ کرسمس کی شب یا سالِ نو کی شب۔ جو کچھ بھی ہو، وہ یا تو ۶۴ء کا اختتام تھا یا ۶۵ء کا آغاز تھا۔ یعنی اس بار پچھلی بار کے مقابلے میں ۱۷ ماہ کی تاخیر ہوئی تھی۔ اب اللہ ہی جانے کہ اس بار عائشہ کتنی لیٹ ہو گی۔

مارٹن نے دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ مجھے یاد تھا کہ ہم نے وہ دن بڑے خوشگوار گذارے تھے۔ ہم نے ان تعطیلات کو خوب انجوائے کیا تھا۔ کیسا بے فکری کا وقت تھا وہ۔ بہت اچھا گزر رہا تھا .... اور ہمیں یقین تھا کہ ہمارا مستقبل بھی اچھا ہی ہو گا۔

مگر اب اس لمحے سے مجھے فکرمند رہنا تھا۔ میری پہلی فکر یہ تھی کہ اب مجھے پیسے کے سلسلے میں کیا کرنا ہے۔ وہ ڈربی ریس، وہ ۶۳ء کی ورلڈ سیریز اب ریکارڈ بک کی زینت بن چکی تھی۔ اب فوری طور پر تو مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں آ رہا تھا، جس کے ذریعے میں نقد رقم حاصل کر سکوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں خواہ مخواہ پریشان ہو رہا ہوں۔ فی الحال مجھے رقم کی ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں جو کچھ مجھے میسر تھا، وہ گزارے کے لئے بہت ہے۔ مسئلہ عائشہ کے انتظار کا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ پامیلا سے عائشہ کب بنے گی۔ اس بار مجھے اس پر نظر رکھنا تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی معصومیت داغ دار ہو۔

چنانچہ میں اس پر نظر رکھے رہا۔ کلاسیں وہ باقاعدگی سے اٹینڈ کرتی تھی۔ سکول میں کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن سکول سے باہر .... وہ بلاشبہ بہت حسین لڑکی تھی۔ لہٰذا مسائل ہی مسائل تھے۔ اس کے تین چار بوائے فرینڈز کی مجھے وقتاً فوقتاً مرمت کرنا پڑی وہ اس پر جھنجلائی۔ ایک بار اس نے مجھ سے پوچھا۔ "تم ہو کیا بلا .... اور میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟"

"جلد ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ تب تم میری شکر گذار ہو گی۔" میں نے جواب دیا۔ "بہرحال میں تم سے وہ کچھ نہیں چاہتا، جو دوسرے لڑکے چاہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری معصومیت برقرار رہے۔ تم پاکیزہ رہو۔"

اسے مایوسی ہوئی۔ وہ یقیناً ڈپریس بھی ہوئی ہو گی۔ اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ میں اسے اچھا لگا ہوں۔ بہرحال اس کے بعد اس نے لڑکوں سے دوستی چھوڑ دی۔ مجھے وہ عجیب سی نظروں سے دیکھتی تھی۔ شاید اسے امید تھی کہ اب میں اس کی طرف پیش قدمی کروں گا لیکن میں نے اسے مایوس کیا۔ ڈپریشن کے نتیجے میں وہ منشیات کی طرف راغب ہو گئی۔ یہاں میں نے اسے نہیں ٹوکا۔ میں پیچیدگیاں پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بس میں دور رہ کر اس پر نظر رکھتا رہا۔

مئی ۶۵ء میں محمد علی اور سونی سٹن کی فائٹ میں، میں نے مالی پوزیشن خاصی مستحکم کر لی تھی۔

☆==========☆==========☆

پامیلا ایلن اور پیٹر کے ساتھ بیٹھی تھی اور نشے میں دھت تھی۔ میں ان کے اتنا

قریب بیٹھا تھا کہ ان کی باتیں سن سکتا تھا۔ وہ لوگ ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

اچانک ایلن بولی۔ "بھئی، اب یہاں سے نکلو بھی۔ میں تو بور ہو گئی ہوں۔"

اس کے بوائے فرینڈ پیٹر نے بھی اس کی تائید کی۔ وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

وہ اڈولف بار میں چلے گئے۔ وہ ہفتے کی رات تھی۔ اس لئے بار میں بہت ہجوم تھا۔ سکول کے قریب وہ واحد بار تھا اور جو طلباء و طالبات چھٹیاں گزارنے گھر نہیں گئے تھے، تقریباً سبھی وہاں موجود تھے۔ میں اس بار بھی ان کے قریب ہی بیٹھا تھا۔

اچانک پاملا نے سر گھما کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی۔ وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے نزدیک میں عجیب آدمی تھا۔ اسے کسی سے ملنے بھی نہیں دیتا تھا اور اس سے تعلقات استوار کرنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سوچتی اور الجھتی ہو گی کہ آخر میں اس سے کیا چاہتا ہوں۔

جیوک باکس پر موسیقی کا ایک مقبول ریکارڈ بج رہا تھا۔ پاملا اب بھی نشے میں تھی اور مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اچانک اس نے ایلن کو ٹھوکا مارا۔ "جانتی ہو، میں کسے پینٹ کرنا پسند کروں گی؟"

"کسے؟"

"وہ .... وہ جو لڑکا بیٹھا ہے۔" پاملا نے آنکھ سے میری طرف اشارہ کیا۔

ایلن نے میری طرف دیکھا۔ "وہ .... اس کی بات کر رہی ہو؟"

اس نے پاملا کے برعکس رازداری کا بالکل خیال نہیں رکھا تھا۔

"ہاں یہی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی عجیب سی بات ہے .... جہاں دیدگی کہہ لو۔ یہ اپنی عمر سے بڑا لگتا ہے۔ ایسا تاثر میں نے کسی اور شخص کی آنکھوں میں نہیں دیکھا۔"

"کیوں نہیں۔" ایلن نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "یہ کوئی فوجی ہو گا۔ ویت نام میں جانے کتنے بچوں اور عورتوں کو قتل کیا ہو گا اس نے۔"

"تم نے پھر وہی سیاسی گفتگو شروع کر دی۔" پیٹر نے اسے ٹوکا۔

"لیکن پام کو تو دیکھو۔ اس شخص پر فدا ہوئی جا رہی ہے۔"

"اوہ!" پیٹر نے کہا اور ہنسنے لگا۔

پاملا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "میں نے ہرگز یہ نہیں کہا۔ میں تو کہہ رہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی عجیب سی بات ہے کہ اسے پینٹ کرنے کو دل چاہتا ہے۔"

پھر ان کے درمیان باتیں ہونے لگیں۔ اب موضوع گفتگو میں نہیں تھا۔ پیٹر کی کسی بات پر پاملا نے ہنسنا شروع کیا۔ اتنا ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر اچانک میں نے اس کا تاثر بدلتے دیکھا۔ وہ حیران نظر آئی، جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو کہ اس بار وہ کہاں ہے۔ آخر اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں اور اِدھر اُدھر دیکھا۔

میں اس تاثر کو سمجھ سکتا تھا۔ میرا انتظار ختم ہو گیا تھا، وہ واپس آ گئی تھی۔

ایلن نے بھی وہ تبدیلی بھانپ لی۔ پاملا ہنستے ہنستے اچانک رک گئی تھی۔ "پام .... کیا بات ہے؟ تم ٹھیک تو ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" پاملا نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ٹھیک تو نہیں لگتیں۔" پیٹر کے لہجے میں تشویش تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" پاملا نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ کون سا سال اور کون سا مہینہ ہے۔

پھر اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی اور ٹھہر کر رہ گئی۔ اس کی نگاہوں میں بے یقینی اور حیرت تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ میں جواباً مسکرا دیا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"پام .... کیا ہو رہا ہے تمہیں؟ رو کیوں رہی ہو؟" ایلن نے کہا۔

پاملا اٹھی۔ اس نے اپنی سہیلی کے کندھے کو تھپتھپایا۔ "میری فکر نہ کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا اور میری طرف بڑھنے لگی۔ اگلے ہی لمحے وہ میری منتظر بانہوں میں تھی۔

☆==========☆==========☆

میں اور پاملا .... نہیں عائشہ .... اکیلے تھے!

"تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ میرا ری پلے شروع ہو گیا ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"میں عرصے سے تم پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔" میں نے اسے تفصیل بتائی، وہ

مجوب ہو گئی۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "اس میں میری اپنی غرض تھی۔"

"تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔" اس کے لہجے میں بھی احسان مندی تھی۔ پھر اس نے پوچھا "تم اس بار کتنا لیٹ ہوئے؟"

"سترہ ماہ!" میں نے جواب دیا۔ "اور یہ مارچ ۶۸ء ہے۔ تم پانچ سال لیٹ ہوئی ہو اس بار۔"

وہ خوفزدہ ہو گئی۔ "تو اگلی بار کیا ہو گا؟ کیا میں..........؟"

میں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ "اگلی بار کی فکر چھوڑو۔ جو میسر ہے، اس سے استفادہ کرو۔ اس بار ہم بہت اچھا وقت گزاریں گے۔ میں ایک منصوبے پر غور کر رہا ہوں۔"

"کیسا منصوبہ؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ اس بار اس پورے چکر کو سائنٹیفک انداز میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ نیشنل سائنس فاؤنڈیشن اور دیگر پرائیویٹ تحقیقاتی اداروں سے بھی رجوع کیا جائے۔ خاص طور پر ایسے اداروں سے جو وقت کی فطرت اور خواص پر ریسرچ کر رہے ہوں۔"

"کون یقین کرے گا ہم پر؟"

"یہی تو سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن ہم نے رازداری کی وجہ سے کبھی اس رکاوٹ کو دور کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی اب تک۔"

"رازداری ضروری ہے ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں پاگل سمجھ لیا جائے۔"

"دیکھو۔ ہم پیش گوئیاں بھی تو کر سکتے ہیں۔ اس جرم میں تو ہمیں کوئی اندر نہیں کر سکتا۔ ہماری پیش گوئیاں درست ثابت ہوں گی تو یہ بھی ثابت ہو گا کہ ہم مستقبل کو جانتے ہیں۔ تب ہماری بات سنی جائے گی، اس پر توجہ دی جائے گی۔"

"تو ہم آغاز کیسے کریں گے؟ تحقیقاتی ادارے تو پیش گوئیوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ ہم ان کے پاس پیش گوئیاں لے کر جائیں گے تو ہمیں کوئی لفٹ نہیں ملے گی۔"

"ہم ان کے پاس نہیں جائیں گے۔ وہ ہمارے پاس آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"میری سمجھ میں تو نہیں آ رہی تمہاری بات۔"

"بھئی.......... ہم پبلک کے پاس جائیں گے۔"

☆==========☆==========☆

نیویارک ٹائمز نے ہمارا پورے صفحے کا اشتہار چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اشتہار نیویارک ڈیلی نیوز، شکاگو ٹریبیون اور لاس اینجلس ٹائمز میں شائع ہوا۔ اشتہار یہ تھا..........

آئندہ بارہ ماہ کے دوران

○ مئی کے اواخر میں امریکہ کی ایٹمی آبدوز اسکارپین سمندر میں گم ہو جائے گی۔

○ جون میں امریکی صدارتی انتخاب کی مہم کو ایک بڑا المیہ درہم برہم کر دے گا۔

○ مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کے قاتل کو امریکہ کے باہر گرفتار کیا جائے گا۔

○ چیف جسٹس ارل وارن ۲۶ جون کو مستعفی ہوں گے۔ ان کی جگہ جسٹس ایب فورٹاس لیں گے۔

○ ۲۱ اگست کو روس چیکوسلواکیہ پر چڑھائی کر کے قبضہ کر لے گا۔

○ یکم ستمبر کو ایران میں زلزلے کے نتیجے میں پندرہ ہزار افراد ہلاک ہو جائیں گے۔

○ اکتوبر میں پیرو اور پناما میں فوجی انقلابات آئیں گے۔

○ رچرڈ نکسن ہیوبرٹ ہمفرے کو معمولی اکثریت سے شکست دے کر صدر منتخب ہو جائیں گے۔

○ کرسمس ویک کے دوران تین امریکی خلا باز چاند کے گرد چکر لگانے کے بعد بحفاظت زمین پر واپس آ جائیں گے۔

○ جنوری ۶۹ء میں روسی لیڈر برزنیف پر ناکام قاتلانہ حملہ ہو گا۔

○ فروری میں جنوبی کیلیفورنیا کے ساحل پر تیل بکھر جائے گا۔

○ فرانسیسی صدر چارلس ڈیگال، اپریل میں استعفیٰ دے دیں گے۔

یکم مئی ۶۹ء تک ہم ان پیش گوئیوں پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔ یکم مئی کو ہم نیوز میڈیا سے ملاقات کریں گے۔ مقام کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ عائشہ و آفاق عباسی۔

☆==========☆==========☆

میڈیا کانفرنس کے لئے ہم نے نیویارک ہلٹن کانفرنس روم کرائے پر لیا تھا۔ کانفرنس روم کھچا کھچ بھرا تھا۔ جنہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی تھی، وہ کھڑے تھے۔ ٹھیک تین بجے میں اور عائشہ کانفرنس روم میں داخل ہوئے اور سپیکرز پلیٹ فارم پر پہنچ گئے۔ ٹی وی کیمروں کی خیرہ کن روشنیوں نے عائشہ کو نروس کر دیا۔ میں نے حوصلہ بڑھانے کے لئے اس کا ہاتھ دبایا۔ کانفرنس روم میں ہمارے داخل ہوتے ہی دبا دبا شور ابھرنے لگا تھا۔ سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی تھی۔ ہر شخص ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہم آپ کے تمام سوالوں کے جواب دیں گے۔" میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ "لیکن ہمیں ڈسپلن سے کام کرنا ہو گا۔ میں پچھلی قطار سے شروع کروں گا .... بائیں سے دائیں۔ ہر شخص ایک سوال کر سکتا ہے۔ پچھلی قطار مکمل ہونے کے بعد اس کے آگے والی قطار کی باری آئے گی۔"

"اور جو لوگ کھڑے ہیں، ان کے متعلق کیا خیال ہے؟" کسی نے چیخ کر پوچھا۔

"ان کی باری بعد میں آئے گی۔ وہ دیر سے آئے ہیں نا۔" میں نے کہا۔ پھر پچھلی قطار میں بائیں جانب بیٹھی ہوئی عورت کی طرف متوجہ ہوا۔ "ہم آپ سے شروع کرتے ہیں۔ اپنی شناخت نہ کرائیں۔ بس سوال کریں۔"

قلم اور پیڈ ہاتھ میں لئے وہ خاتون اٹھی۔ "میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ نے اتنے مختلف میدانوں میں اتنی درست پیش گوئیاں کیسے کیں؟ یا آپ کے پاس سائیکک قوت ہے؟"

میں نے ایک گہری سانس لی اور لہجے کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ "میں نے عرض کیا تھا کہ صرف ایک سوال۔ تاہم اس بار میں دونوں سوالوں کے جواب دوں گا۔" میں نے کہا۔ "نہیں، ہم سائیکک نہیں ہیں۔ عائشہ اور میں .... ہمارے ساتھ ایک انہونی ہوئی ہے۔ ہم کسی کو یقین نہیں دلا سکتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم یہ زندگی پہلے بھی گذار چکے ہیں۔ اس عہد میں کئی بار جی چکے ہیں ہم۔ اکتوبر ۹۳ء میں ہم مرجاتے ہیں۔ اس بار بھی مرجائیں گے اور شاید ہم پھر واپس آئیں گے۔"

کانفرنس روم میں شور برپا ہو گیا۔ ایسی ناقابلِ یقین بات........! ایک ٹی وی کے عملے نے تو کیمرے اور لائٹیں بند کیں اور سامان پیک کرنے لگے۔ کئی صحافی یوں باہر گئے،

جیسے میرے جواب سے ان کی توہین ہوئی ہے۔ ان کی کرسیاں کھڑے ہوئے لوگوں نے سنبھال لیں۔

میں نے لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اگلے صحافی کو دعوتِ سوال دی۔ "آپ یہ توقع کیسے کرتے ہیں کہ ہم اس خرافات پر یقین کر لیں گے؟" اس صحافی نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

میں نے ایک سال پہلے جو پیش گوئیاں کی تھیں، وہ حرف بحرف پوری ہوئی ہیں" میں نے خود کو پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہماری بات پر یقین کرنا مشکل ہے لیکن سچ یہ ہے کہ وہ پیش گوئیاں ہمارے لئے ایسے واقعات تھے، جو ہماری یادداشت میں محفوظ تھے۔ ہماری پوری بات سن لیں۔ پھر فیصلہ تو آپ لوگوں کو ہی کرنا ہے۔"

"آج آپ مزید پیش گوئیاں کریں گے؟" تیسرے صحافی نے پوچھا۔

"جی ہاں لیکن سوالوں کے جواب دینے اور اپنی پوری بات کہنے کے بعد۔" میں نے جواب دیا۔

ہمیں اپنی زندگی کا خاکہ پیش کرنے میں ایک گھنٹہ لگا۔ ہم نے نجی نوعیت کی باتیں چھپائیں۔ باقی سب کچھ تفصیل سے بتایا۔

"یہ سب بتانے کا مقصد کیا ہے؟" ایک صحافی نے پوچھا۔ "دولت بنانا .... یا آپ کسی نئے عقیدے کی داغ بیل ڈال رہے ہیں؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "دولت ہمارے لئے مسئلہ نہیں۔ ہم سرمایہ کاری کے ذریعے جتنی دولت چاہیں، بنا سکتے ہیں۔ ہم بس جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی کوئی توضیح بھی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تحقیقاتی ادارے اس طرف توجہ دیں۔ طبیعیات دان اس مسئلے پر غور و فکر کریں۔ صرف اس لئے ہم اس مسئلے کو پبلک میں لائے ہیں۔"

کمرہ پھر سرگوشیوں سے بھر گیا تھا۔ صحافیوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی سکیم نہیں ہے۔ صحافی چبھتے ہوئے سوال کرتے رہے اور میں ٹھنڈے دل و دماغ سے جواب دیتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔ "اب اگر آپ لوگوں کے سوالات ختم ہو گئے ہیں تو میں یہ

نئ پیش گوئیاں آپ لوگوں میں تقسیم کر دوں............"

اچانک ہی سوالات کے سوتے پھر سے پھوٹ پڑے۔ "کیا ایٹمی جنگ ہو گی؟ ہم روسیوں سے پہلے چاند پر پہنچ سکیں گے؟ سرطان کا علاج دریافت ہو جائے گا؟"

"سوری!" میں نے کہا۔ "مستقبل کے بارے میں، میں کوئی جواب نہیں دوں گا۔ اس سلسلے میں جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں، وہ تحریری شکل میں آپ کو دے رہا ہوں۔"

"صرف ایک سوال اور۔" چشمہ لگائے ہوئے ایک شخص کھڑا ہوا۔ "بس یہ بتا دیں کہ اس ہفتے کینٹکی ڈربی کون جیتے گا؟"

میں مسکرایا۔ اس سوال نے میری اعصابی کشیدگی دور کر دی۔ "چلیں.......... اس سوال کو میں مستثنیٰ قرار دیتا ہوں۔ یہ ریس میجسٹک پرنس جیتے گا۔ پریکنیس میں بھی یہی گھوڑا جیتے گا لیکن ٹرپل کراؤن نہیں جیت سکے گا۔ تیسری ریس آرٹ اینڈ لیٹرز نامی گھوڑا جیتے گا۔" میں پھر مسکرایا۔ "اب یہ راز افشا کر کے میں نے اپنا مالی نقصان کر لیا ہے۔"

☆==========☆==========☆

میجسٹک پرنس پر اتنی کثرت سے شرطیں لگائی گئیں کہ اس کے ریس جیتنے سے شرطیں لگانے والوں کو فائدہ برائے نام ہی ہوا۔ کینٹکی ریس کمیشن نے اس معاملے کی تحقیقات کا حکم دے دیا اور پریکنیس اور بیلمونٹ کی ریسیں کینسل کرنے پر غور کیا جانے لگا۔

ہمارا آفس پین ایم بلڈنگ میں تھا۔ ریس کے بعد پیر کی صبح چھ بجے سے جو فون کی گھنٹی نے بجنا شروع کیا تو یہ سلسلہ دوپہر تک چلتا رہا۔ ہم نے کالیں وصول کرنے کے لئے شاف میں دو لڑکیوں کا پہلے ہی اضافہ کر دیا تھا۔ ہم سے ملنے کے لئے آنے والے متجسس لوگ اس پر مستزاد تھے۔ نیویارک ٹائمز نے اپنے اداریے میں ہمیں دور جدید کے نوسٹرے ڈامس قرار دیتے ہوئے لوگوں کو دھپل باز لوگوں سے بچنے اور ہوشمندی برقرار رکھنے کی تلقین کی تھی۔

دوپہر کو فون ریسیو کرنے والی لڑکی نے میرے سامنے ایک فہرست لا کر رکھ دی۔ ۱۴۲ افراد نے ذاتی طور پر مجھ سے ملنے کی خواہش کی تھی۔ ان میں شدید بیمار لوگ بھی تھے اور وہ والدین بھی جن کے بچے گم ہو گئے تھے۔ ان میں سٹاک بروکر بھی تھے، جو برائے نام

کمیشن پر مجھے اپنی خدمات پیش کرنا چاہتے تھے۔ آٹھ ٹیلی گرام ایسے افراد کے تھے، جو مختلف سکیموں پر بھاری رقوم لگانا چاہتے تھے۔ گیارہ ایسے سائیکک بھی تھے، جو ہمارے اشتراک میں کام کرنا چاہتے تھے۔

"لیکن ہم سائیکک نہیں ہیں ایلن۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "تم اور پامیلا یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔"

"میں سمجھتی ہوں جناب.......... لیکن.........."

"تم اس حقیقت کو قبول نہیں کر پا رہی ہو۔ یہی بات ہے نا؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "لیکن تم جو چاہو، سمجھو۔ ہمیں غلط سمجھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہرگز نہ کرنا۔ ہاں.......... اور بتاؤ۔"

"جی ہاں۔ کئی ائر لائنز کے وکلاء نے فون کر کے قانونی کارروائی کی دھمکی دی ہے" ایلن نے بتایا۔ میں نے بے پروائی سے سر ہلایا۔ "کچھ میگزین ہیں جو آپ سے خصوصی انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔"

"ان میں کوئی علمی پرچہ بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔ ایلن نے نفی میں سر ہلایا۔ "اور کسی یونیورسٹی یا کسی ریسرچ فاؤنڈیشن نے اب تک رابطہ نہیں کیا؟"

"نہیں جناب۔"

"ٹھیک ہے ایلن۔ شکریہ، مجھے باخبر رکھتی رہنا۔"

وہ پیڈ اٹھا کر جانے لگی۔ جاتے جاتے اچانک پلٹی۔ "سر.......... ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

"ضرور۔"

"مجھے شادی کرنا چاہئے یا نہیں۔ میرا بوائے فرینڈ بہت اصرار کر رہا ہے۔ مگر میں ڈرتی ہوں۔ آپ یہ بتا دیں کہ یہ شادی کامیاب ہو گی یا نہیں۔"

"کاش.......... مجھے معلوم ہوتا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

☆==========☆==========☆

میکسیکو ائر لائن نے ہمارے خلاف کیس پانچ جون کو واپس لے لیا۔ میری اور عائشہ کی پیش گوئی کے عین مطابق ان کا ایک مسافر بردار جہاز مونٹیرے کے قریب پہاڑ سے

ٹکرا کر تباہ ہو گیا تھا۔ مقامی سیاسی لیڈر کارلوس میڈرازو اور ٹینس کا کھلاڑی رافیل اوسونا اس جہاز کے مسافروں میں شامل نہیں تھے۔ جہاز میں ۷۹ مسافروں کے بجائے صرف ۱۱ مسافر تھے۔ ۶۸ نے ہماری پیش گوئی کو اہمیت دے کر جان بچالی تھی۔ اس کے بعد صرف دو فضائی کمپنیاں ایسی تھیں، جنہوں نے ہماری تنبیہ کے باوجود پروازیں منسوخ نہیں کی تھیں۔ ۶۹ء میں صرف انہی دو کمپنیوں کے جہازوں کو حادثے پیش آئے۔

امریکی نیوی نے ہماری پیش گوئی کو توہم اور ضعیف الاعتقادی قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔ تباہ کن بحری جہاز ایوانز جنوبی چین کے سمندر میں اپنے طے شدہ سفر پر روانہ ہو گیا تھا لیکن آسٹریلوی حکومت نے اپنے طیارہ بردار جہاز کو ملبورن بلا کر لنگر انداز کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ حادثہ نہیں ہوا، جس میں ایوانز کو دو ٹکڑے ہو جانا تھا۔ چار جولائی کو لیک ایری کے طوفان نے ۴۱ کے بجائے صرف ۱۵ افراد کی جان لی۔ کیونکہ ہماری وجہ سے طوفان سے کافی پہلے انخلا کی کارروائی شروع کر دی گئی تھی۔ ایسی ہی صورتِ حال مسی سپی میں پیش آئی۔

دنیا ان باتوں کو نظرانداز کیسے کر سکتی تھی!

☆==========☆==========☆

"مچل ....میں فوری طور پر کارروائی چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

میرا وکیل اپنے چشمے کے شیشے صاف کرنے میں منہمک تھا۔ "یہ ممکن نہیں ہے ایفاک!" بالآخر وہ بولا۔

"کیوں آخر؟" مجھے غصہ آگیا۔ "لوگ ہمیں جس طرح چاہیں، استعمال کریں۔ ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

مچل چمکتے ہوئے شفاف شیشوں کو پھر صاف کرنے لگا۔ "دیکھو ایفاک، پہلی ترمیم میں دیئے گئے حقوق کے تحت وہ ایسا کر سکتے ہیں۔"

"وہ ہمیں بدنام کر رہے ہیں۔" میں پھٹ پڑا۔ میں نے وہ پمفلٹ لہرایا، جس کی وجہ سے مجھے مچل کو طلب کرنا پڑا تھا۔ اس کتابچے کے کور پر میری تصویر بے حد نمایاں تھی "یہ لوگ میرے نام سے اور میرے بیانات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں جبکہ میں نے انہیں اس کی اجازت بھی نہیں دی۔ یہ تو ہمارا مذاق بنوادیں گے۔"

"یہ مالی منفعت حاصل کرنے والا ادارہ نہیں ہے۔" مچل نے کہا۔ "مذہبی تنظیم ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ٹیکس سے استثنا کی درخواست بھی دی ہے۔ ان سے کیسے لڑا جا سکتا ہے۔ برسوں لڑنے کے بعد بھی ہماری جیت کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوں گے۔"

"ازالہ حیثیت عرفی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"آپ عوامی شخصیت بن چکے ہیں۔ لہٰذا ازالہ حیثیت عرفی کا قانون آپ کو زیادہ تحفظ فراہم نہیں کر سکتا۔ پھر آپ کے بارے میں ان کا تبصرہ اور اس کے الفاظ توہین آمیز

بھی نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس اس انداز میں پرستش ہے۔ وہ تو آپ کو دیوتا مانتے ہیں۔ میری مانیں تو انہیں نظرانداز کر دیں۔ قانونی چارہ جوئی کے نتیجے میں مزید پبلسٹی ملے گی آپ کو۔"

میں نے غصے سے پمفلٹ کو توڑ مروڑ کر اس کی گیند بنائی اور اسے ایک طرف اچھال دیا۔ "یعنی ہم داغ دار ہوتے رہیں۔ ایسے میں کوئی سائنسی تحقیقاتی ادارہ بھلا ہماری طرف متوجہ ہو گا؟"

"میں آپ کی کیفیت سمجھ رہا ہوں لیکن.........." مچل کی بات ادھوری رہ گئی۔ میری میز پر رکھے انٹرکام کا بزر چیخ اٹھا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ایلن نے کہا۔ "سر ایک شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے کہ اس کا تعلق وفاقی حکومت سے ہے۔"

"کس ڈیپارٹمنٹ سے آیا ہے۔ سول ڈیفنس سے یا کوئی سائنسی تحقیقاتی ادارہ؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا تعلق سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے ہے جناب۔ اور وہ مصر ہے کہ آپ سے اور مسز عباسی سے ضرور ملے گا۔"

"اسے اندر بھیج دو ایلن!" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ وکیل مچل میری طرف متوجہ تھا۔ اگلے ہی لمحے نیلی آنکھوں والا ادھیڑ عمر شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے اور عائشہ کو تولنے والی نظروں سے دیکھا۔ پھر مچل کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میں تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

مچل نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں ان کا وکیل ہوں، مچل وِیڈ۔"

اس شخص نے جیکٹ سے اپنا کارڈ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ "میں رسل ویجز ہوں.......... فرام سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور مجھے رازداری سے گفتگو کرنی ہے۔ آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے مسٹر وِیڈ؟"

"میں تو مائنڈ کروں گا۔ میرے مؤکلوں کو حق حاصل ہے کہ.........."

"یہ ایسی صورت حال نہیں، جس میں انہیں قانونی امداد یا مشورے کی ضرورت ہو" رسل نے کہا۔ "یہ معاملہ قومی سلامتی سے متعلق ہے۔"

مچل احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ "کوئی بات نہیں مچل۔ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم میری باتوں پر غور کرو اور کوئی صورت نکالنے کی سوچو۔ میں کل تمہیں فون کروں گا۔"

"ضرورت محسوس کرو تو آج ہی فون کر لینا۔ میں دفتر میں ہی رہوں گا۔" مچل نے رسل کو گھورتے ہوئے کہا۔

مچل کے جانے کے بعد رسل نے عائشہ کی اجازت سے سگریٹ سلگائی اور مجھے بغور دیکھتا رہا۔ "ہم تم سے بے خبر نہیں ہیں مسٹر عباسی!" بالآخر اس نے آغاز کلام کیا۔ "کیوں نہ ہوں۔ تم میڈیا کی توجہ کا مرکز جو بنے ہوئے ہو۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے ساتھی اب تک تمہیں شعبدہ گر سمجھتے رہے تھے۔"

"تمہارا اشارہ لیبیا کی طرف ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

رسل ویجز نے اثبات میں سرہلایا "ہاں.......... اس معاملے نے سب کو حیران کر دیا ہے۔ ہماری انٹیلی جنس کا کہنا تھا کہ شاہ ادریس بے حد مستحکم ہے۔ اس کی حکومت کو کوئی خطرہ نہیں جبکہ تم نے انقلاب کی تاریخ تک بتائی تھی۔ یہ بھی بتایا تھا کہ انقلاب فوج کے بالائی طبقے سے نہیں، درمیانی طبقے سے آئے گا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا۔"

"یہ میں آخری ممکن حد تک پہلے ہی واضح کر چکا ہوں۔"

"یہ کہ تم یہ عرصہ .... یہ زندگی پہلے بھی گزار چکے ہو۔" اس نے کہا۔ "خود بتاؤ، کیا یہ قابلِ یقین ہے؟"

"یہ تمہارا دردِ سر ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "ہم تمہیں صرف حقیقت بتا سکتے ہیں۔ یقین کرنا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔ ہم نے اس بار جو خود کو تماشا بنایا ہے تو صرف اسی لئے کہ ہم خود بھی اس گورکھ دھندے کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ میں یہ سب کچھ پہلے بھی بتا چکا ہوں۔"

عائشہ آگے کو جھک آئی۔ "دیکھو .... یہاں ایسے کئی تحقیقاتی ادارے ہیں جو اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔"

"لیکن میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔"

"تم انہیں قائل تو کر سکتے ہو کہ وہ ہمارے معاملے میں سنجیدگی سے غور کریں۔"

"اس کے بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟" رسل نے ایش ٹرے میں راکھ گراتے ہوئے پوچھا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"اس تحقیقی کام میں افرادی قوت، سرمایہ اور آلات .... سبھی کچھ لگے گا۔ ہمیں اس کا کچھ صلہ بھی تو ملے۔"

عائشہ نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ "تم دنیا میں رُونما ہونے والے اہم واقعات کے بارے میں پہلے سے جاننا چاہتے ہو؟" اس نے رسل سے پوچھا۔ "ہاں .... ہم ہزاروں افراد کو موت سے بچا سکتے ہیں۔ اب لیبیا ہی کی مثال لے لو۔ جو کچھ وہاں ہوا، اس کے نتائج بہت دور تک جائیں گے۔ اگلے سال کے اوائل میں کرنل معمر قذافی وزیراعظم بن جائے گا۔ ۲۵ سال تک تو تمہاری اس سے جان نہیں چھوٹے گی اور اس عرصے میں لیبیا دہشت گردوں کی جنت بن جائے گا۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس کی وجہ سے کیا کچھ ہو گا۔"

رسل نے کندھے جھٹک دیئے۔ "یہ بہت مبہم اور غیر واضح باتیں ہیں۔ ان کو ثابت ہونے میں تو برسوں لگیں گے۔ ہمیں اس وقت جنوب مشرقی ایشیا کے معاملات میں دلچسپی ہے۔"

عائشہ نے نفی میں سرہلایا۔ "ویت نام میں تو سمجھ لو کہ تمہیں شکست ہو چکی ہے" اس نے کہا۔ "آئندہ برسوں میں اہمیت صرف مشرق وسطیٰ کی ہو گی۔"

"سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں ایک چھوٹا سا گروپ ہے۔ اس کی بھی یہی رائے ہے" رسل بولا۔ "اور ویت نام کے بارے میں جو تم نے فیصلہ سنایا ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا۔ ہوچی منہ مرچکا ہے۔ ہمارے تجزیہ کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اب اس کی پارٹی کمزور پڑ جائے گی۔"

"اس کے برعکس..........." میں نے مداخلت کی "........... اب ان کی مزاحمت اور شدید ہو جائے گی۔ ہوچی منہ کا قد موت کے بعد اور بڑا ثابت ہو گا۔ سائیگاؤں کا نام بدل کر ہوچی منہ کے نام پر رکھا جائے گا۔"

"تاریخ بتاؤ۔"

"دیکھو .... ہمیں تم کو سوچ سمجھ کر معلومات فراہم کرنا ہوں گی۔" میں نے کہا اور عائشہ کو تنبیہی نظروں سے دیکھا۔ "ہم پیچیدگیوں میں اضافہ نہیں چاہتے۔ بس انسانیت کو جس حد تک المیوں سے بچا سکتے ہیں، اس کے لئے کوشش کریں گے۔"

"میرے محکمے میں اب بھی ایسے لوگ ہیں جو تمہیں فراڈ سمجھتے ہیں۔ اگر تم صرف عام سی بات بتاؤ گے تو..........."

"اگلے ہفتے ہوچی منہ اور کوسیگن کی ملاقات ہو گی۔" میں نے کہا۔ "ملاقات پیکنگ میں ہو گی اور اگلے ماہ چین اور روس کے درمیان سرحدی تنازعات پر مذاکرات ہوں گے۔"

رسل مجھے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔ "یہ کیسے ممکن ہے، کوسیگن کبھی چین نہیں جا سکتا۔"

"دیکھ لینا۔ وہ وقت دور نہیں اور کوسیگن کیا، رچرڈ نکسن کو بھی چین کا دورہ کرنا ہے۔" میں نے دھماکا کیا۔

☆==========☆==========☆

مارچ کا مہینہ تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ رسل ویجز اپنی بھیگی ہوئی سگریٹ سلگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک اس نے پوچھا۔ "ایلینڈ کے جیتنے کا کوئی امکان ہے؟"

"تمہارا مطلب ہے کہ چلی کی سیاست میں تم لوگوں کے عمل دخل کے باوجود کیا ایلینڈ منتخب ہو جائے گا۔" میں نے پوچھا۔ اس وقت تک مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ رسل ویجز کا سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے برائے نام تعلق ہے۔ اب وہ سی آئی اے میں ہے یا این ایس اے میں یہ ہم نہیں کہہ سکتے تھے اور اس سے فرق بھی کوئی نہیں پڑتا تھا۔

رسل ویجز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ نہ بتاؤ کہ وہ الیکشن جیتے گا یا نہیں۔ صرف اتنا بتا دو کہ اس کی کامیابی کا امکان ہے یا نہیں؟"

"اور اگر میرا جواب ہاں میں ہو تو تم ویسی ہی کارروائی کرو گے، جیسی قذافی کے خلاف کی تھی؟" میں نے لیبیا کا حوالہ دیا۔

"قذافی کے قتل سے ہمارا تعلق نہیں تھا۔ یہ میں تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں کہ وہ لیبیا

کا اندرونی معاملہ تھا۔ تم تو جانتے ہو کہ تیسری دنیا کے ملکوں میں اقتدار کی چھینا جھپٹی میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔"

میں جانتا تھا کہ بحث لاحاصل ہے۔ میں جانتا تھا کہ قذافی کو قتل کیا گیا تھا.......... صرف اس لئے کہ عائشہ نے اس کی مستقبل کی پالیسیوں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ قذافی کا قتل میرے لئے ضمیر کا بوجھ بن گیا تھا۔ یہ خبر عام تھی کہ قذافی کے قتل میں سی آئی اے کا ہاتھ تھا اور ان افواہوں کے رد عمل کے طور پر لیبیا میں نومبر اسکواڈ نامی ایک دہشت پسند تنظیم ابھری تھی، جس کا قائد قذافی کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس گروپ نے قذافی کا انتقام لینے کی قسم کھائی تھی۔ تین ماہ پہلے نومبر اسکواڈ نے ٹریپولی کے جنوب میں واقع موبل آئل کے ایک ذخیرے کو اڑا دیا تھا۔ اس واقعے میں گیارہ امریکی مارے گئے تھے اور آگ ابھی تک بھڑک رہی تھی۔ مستقبل میں اس گروپ کو کیا کچھ کرنا تھا، یہ کوئی نہیں جانتا تھا لیکن آثار بتاتے تھے کہ قذافی سے نجات تشدد کے معاملے میں ہزار گنا مہنگی پڑی ہے۔

اور چلی کا ایلینڈ قذافی سے مختلف آدمی تھا۔ وہ معقول آدمی تھا اور تاریخ میں پہلا مارکسی صدر تھا، جو آزادانہ انتخابات میں منتخب ہوا تھا اور مجھے یاد تھا کہ امریکیوں نے اسے مروا دیا تھا۔ یعنی کچھ عرصے بعد اسے مرجانا تھا۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ اس کی موت کو اور قریب لے آؤں۔

"ایلینڈ کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ امریکہ کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔" میں نے رسل سے کہا۔

"ہیتھ کے برطانیہ کا وزیراعظم بننے کے بارے میں بتاتے ہوئے تو تم بالکل نہیں ہچکچائے تھے۔"

"شاید اس لئے کہ تم کہیں ہیرالڈ ولسن کو شوٹ ہی نہ کروا دو۔"

رسل آپے سے باہر ہو گیا۔ "امریکہ کی خارجہ پالیسی پر اخلاقی فیصلے صادر کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔ تمہارا کام بس ہمیں پیشگی معلومات فراہم کرنا ہے۔ کچھ کرنے نہ کرنے کا فیصلہ اہل لوگ کریں گے۔"

"میں ان فیصلوں کے نتائج بھی دیکھ چکا ہوں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"چنانچہ میں بہت سوچ سمجھ کر معلومات ظاہر کروں گا اور پھر.........." میں کہتے کہتے رکا۔

"ہمارا دو طرفہ معاہدہ تھا۔ ہمارے سلسلے میں بھی کوئی پروگریس ہوئی؟" ہم چھ ہفتے سے اینا پولس کے جنوب میں میری لینڈ کے مغربی ساحل پر واقع سرکاری بنگلے میں مقیم تھے۔ ابتدا میں تو ہمیں ایسا لگا جیسے ہم پرُلطف تعطیلات گزار رہے ہیں۔ مگر اب میں رسل وبجز کی مسلسل تفتیش سے بیزار ہو چکا تھا۔ وہ مسلسل ہم سے چپکا ہوا تھا۔ "تم نے جواب نہیں دیا۔" میں نے رسل کو ٹوکا۔

"کوئی خاص پروگریس نہیں ہے۔" رسل نے کہا۔ "وہ مزید کچھ ٹیسٹ کرنا چاہتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے، ہمارا ہر ممکن ٹیسٹ ہو چکا ہے۔" میں جھنجلا گیا۔ "اب تک وہ ذرا بھی تو پیشرفت نہیں کر سکے ہیں۔"

"مجھے تو بے وقوف بننے کا احساس ہو رہا ہے" عائشہ بولی۔

"ہم اب نیویارک واپس جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم ہمارے لئے آج رات کسی فلائٹ کا بندوبست کر سکتے ہو؟"

"آئی ایم سوری۔"

"کوئی بات نہیں۔ سرکاری طیارہ نہ سہی۔ ہم کوئی کمرشل فلائٹ پکڑ لیں گے۔ عائشہ، ایسٹرن ائرلائنز کو فون کر کے معلوم کرو.........." اچانک بٹلر آگے بڑھا۔ اس کا ایک ہاتھ جیکٹ میں تھا۔ ایک اور گارڈ کھلے دروازے سے اندر آ گیا، جیسے کسی نے اسے کوئی اشارہ کیا ہو۔ ایک اور گارڈ سیڑھیوں پر نمودار ہو گیا تھا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں سرکاری فلائٹ کا بندوبست نہیں کر سکتا۔" رسل نے سرد لہجے میں کہا۔ "بات یہ ہے کہ تمہیں یہاں سے کہیں جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

☆==========☆==========☆

اب ہم عملاً اسیری کی زندگی گزار رہے تھے۔ ۷۹ء تھا اور اس ری پلے میں دنیا کا نقشہ ہی بدل کر رہ گیا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ایک واقعے کی تبدیلی سے تاریخ تک بدل سکتی ہے۔ کچھ اس میں قذافی کی موت کا بھی دخل تھا۔ پھر واٹر گیٹ سکینڈل کے بارے میں میرے انکشافات کے نتیجے میں امریکہ کی سیاسی تاریخ بھی بدل گئی تھی۔ صدر

نکسن نے دوبارہ الیکشن نہیں لڑا تھا۔ ۷۲ء میں جمی کارٹر صدر بنا تھا اور رونالڈ ریگن ۷۶ء ہی میں صدر منتخب ہو گیا تھا۔ نکسن کی امن پسندی کے برعکس ریگن میں جارحیت تھی۔ چنانچہ ایران کا نقشہ بھی بدل گیا تھا۔ رضا شاہ پہلوی کے خلاف چلنے والی تحریک میں امریکہ خاموش تماشائی نہیں بنا رہا تھا بلکہ اس نے ایران میں فوجیں اتار دی تھیں۔

اس وقت ہم ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ خبریں نشر ہو رہی تھیں "............ ایرانی انقلابیوں نے تہران میں امریکی سفارت خانے پر بزور قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ ان انقلابیوں نے گذشتہ فروری سے سفارت خانے کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ امیرکی فوج کے ۸۲ ویں ڈویژن نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اس تصادم میں ۱۳۰ امریکی فوجی ہلاک اور ڈھائی سو کے لگ بھگ زخمی ہوئے۔ ۱۸۲ انقلابی بھی اس جھڑپ میں مارے گئے۔ صدر ریگن نے تبریز کے مشرق میں انقلابی کمان کے پہاڑی ٹھکانوں پر فضائی حملوں کا حکم دیا ہے۔ انٹیلی جنس کی اطلاع کے مطابق آیت اللہ خمینی انہی ٹھکانوں میں سے کسی میں چھپے ہوئے ہیں............"

"اس منحوس ٹی وی کو بند کر دو نا؟" میں نے رسل پر آنکھیں نکالیں لیکن اس نے مجھے نظرانداز کر دیا۔

"............ یہاں امریکہ میں گذشتہ ہفتے میڈیسن اسکوائر گارڈن پر دہشت گردی کی کارروائی کے نتیجے میں مرنے والوں کی تعداد ۶۸۲ تک پہنچ گئی ہے۔ لیبیا کے نومبر اسکواڈ نے ایک نشریے میں دھمکی دی ہے کہ جب تک مشرق وسطیٰ سے امریکی فوجیں نہیں نکل جاتیں، امریکی سرزمین پر ان کی کارروائیوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ روس کے وزیر خارجہ نے اعلان کیا ہے کہ روس کی ہمدردیاں دنیا بھر کے حریت پسندوں کے ساتھ ہیں۔ مسٹر گرومیکو نے بحیرۂ عرب میں امریکہ کے چھٹے بحری بیڑے کی موجودگی کو............"

اس بار میں نے خود آگے بڑھ کر ٹی وی کو بند کر دیا۔ رسل ویبز نے کندھے جھٹک دیئے۔ اس کی انگلیاں ہاتھ میں موجود پنسل سے کھیلتی رہیں۔ "افغانستان میں روسیوں کی بڑھتی ہوئی فوجوں کے بارے میں کیا کہتے ہو تم؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔ "وہ ایران میں موجود ہماری فوجوں سے تو نہیں الجھیں گے؟"

"مجھے نہیں معلوم" میں نے سوگواری سے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ خمینی کے حامی کتنے طاقتور ہیں۔ اگلے سال کے انتخابات تک ہم شاہ کو پاور میں رکھ سکتے ہیں؟"

"مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔" میں پھٹ پڑا۔ "کیسے معلوم ہو سکتا ہے مجھے؟ پہلے اس عرصے میں جمی کارٹر صدر تھا، ریگن نہیں اور امریکہ نے ایران میں فوجیں بھی نہیں اتاری تھیں۔ سب کچھ بدل گیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کب کیا ہو جائے............"

"پھر بھی تمہیں اندازہ ہو گا............"

"بالکل نہیں۔" میں نے عائشہ کی طرف دیکھا، جو خاموش بیٹھی رسل ویبز کو گھور رہی تھی۔ اس کی تازگی رخصت ہو چکی تھی۔ وہ اپنی عمر سے کہیں بڑی لگ رہی تھی۔ میرا اپنا بھی یہی حال تھا۔ اس پُرتعیش قید نے ہمیں وقت سے پہلے تھکا دیا تھا۔ "اب ہم ذرا ٹہلنے جا رہے ہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ عائشہ بھی اٹھ گئی۔

"ابھی میرے پاس کچھ اور سوال ہیں۔" رسل نے کہا۔

"مگر میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ اپنے سوالوں پر خود ہی غور کرتے رہو۔"

رسل چند لمحے مجھے گھورتا رہا۔ پھر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ ڈنر کے بعد بات کریں گے۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ اُس کا کوئی فائدہ نہیں ہے لیکن میں خاموشی سے عائشہ کو لے کر باہر نکل آیا۔ دنیا ایک ایسے راستے پر، ایسی سمت میں بڑھ رہی تھی جس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا لیکن یہ بات رسل کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہم سائیکک ہیں۔ ہم میں پیش بینی کی قدرتی صلاحیت ہے اور اس صورتِ حال میں ہم کچھ بتا ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ بدبخت ہمیں الزام دیتا تھا کہ ہم معلومات چھپا رہے ہیں۔ حالانکہ ہم پر سوڈیم پنٹو تھول کا استعمال بھی کیا گیا تھا اور ہمارے پولی گراف کے سیشن بھی ہوئے تھے مگر وہ مطمئن پھر بھی نہیں تھا۔ ہم نے سچ بلوانے والی دوا اور پولی گراف ٹیسٹ کو یہ سوچ کر قبول کر لیا تھا کہ اس طرح اسے معلوم ہو جائے گا کہ ہم معلومات سے تہی ہو چکے ہیں............ اور شاید پھر ہمیں بے ضرر سمجھ کر اس "حفاظتی تحویل" سے رہا کر دیا جائے لیکن یہ امید بس امید ہی رہی تھی۔ اب ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ ہم مر کر ہی قید سے رہا ہوں گے۔

ہم ساحل پر آ گئے اور جانے پہچانے ریتلے ٹیلوں کے درمیان چہل قدمی کرتے

رہے۔ دو گارڈ کچھ فاصلے سے ہمارے پیچھے چل رہے تھے۔ "ہم ان سے جھوٹ کیوں نہیں بول سکتے؟" عائشہ نے کہا۔ "ان سے کہہ دو کہ ایران میں امریکی فوج کی موجودگی جنگ کا باعث بنے گی۔" وہ کہتے کہتے رکی۔ "اور کون جانے، ہو بھی ایسا ہی۔"

میں چلتے چلتے رک گیا۔ "سوڈیم پنٹو تھول آزمایا گیا تو جھوٹ کھل جائے گا۔"

"پھر بھی کوشش تو کر دیکھیں۔"

"ہمیں یہ بھی تو نہیں معلوم کہ اس جھوٹ کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ ہماری وجہ سے ایک ایسی جنگ بھی تو شروع ہو سکتی ہے، جسے نہ ہونا ہو۔ ایسا ہوا تو خواہ مخواہ خوں ریزی ہو گی اور اس کے ذمے دار ہم ہوں گے۔"

عائشہ کے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی۔ میں نے اسے دلاسہ دیا۔ "عائشہ .... ہم نے انسانی جانیں بچائی بھی تو ہیں۔"

"انسانی زندگی کو بیلنس شیٹ پر نہیں تولا جا سکتا۔" عائشہ نے جھنجلا کر کہا۔ "اور پھر اب یہ لوگ طوفان، زلزلے اور حادثوں کے متعلق جان کر بھی بچاؤ کے لئے کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ صرف اس لئے کہ یہ روسیوں کو اور باقی دنیا کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ صرف اتنی سی مصلحت پر انہوں نے ان لوگوں کو موت کے گھاٹ اتر جانے دیا، جنہیں بچایا جا سکتا تھا۔"

"وہ لوگ پہلے بھی تو مرے تھے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

☆==========☆==========☆

دو سال اور گزرے۔ رسل ویجز اور اس کے آقاؤں کو یقین آ گیا کہ مستقبل کے بارے میں معلومات کے ہم دونوں انسانی کنوئیں خشک ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ہمارا پیچھا چھوڑ دیا لیکن ہمیں رہائی پھر بھی نہیں ملی۔ ہم ان کی حفاظتی تحویل میں ہی رہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم روسیوں کے ہتھے چڑھ جائیں۔ ہم بھی نہیں چاہتے تھے کہ پھر پولی گراف ٹیسٹ اور سوڈیم پنٹو تھول کی ڈوز کے تجربوں سے گزریں۔ ہم جانتے تھے کہ روسی اس سے بھی آگے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اس قید کو نعمت سمجھ کر قبول کر لیا۔ یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہی تھی کہ ہم اب بھی وی آئی پی تھے۔ ہم جو طلب کرتے، ہمیں فراہم کر دیا جاتا۔

اب تنہائی تھی اور ہم۔ ریڈیو ٹی وی سے ہمیں نفرت ہو گئی تھی۔ لگتا تھا، آپس میں بات کرنے کے لئے بھی کچھ نہیں رہا ہے۔ ایسے میں صرف مطالعہ ہی رہ جاتا تھا۔ چنانچہ کتابیں ہی ہم دونوں کی رفیق بن گئیں۔ مگر فکشن اور لٹریچر میں سے بیشتر ہم پہلے ہی پڑھ چکے تھے۔ پھر اچانک ایک دن عائشہ کو خیال آیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ دینی کتابیں ہم نے کبھی پڑھی بھی نہیں تھیں۔ سو ہم نے دینی کتب منگوانی شروع کیں۔ بس پھر اس کے بعد طمانیت ہی طمانیت تھی، سکون ہی سکون تھا۔ روح کو ایسی خوشی ملی کہ جس کا ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

پچھلے برسوں میں ہمارے درمیان جو سرد مہری پیدا ہوئی تھی، دور ہو گئی۔ ہمیں گفتگو کرنے کے لئے ایک ایسا موضوع مل گیا، جو کبھی ختم نہ ہوتا۔ ہم کتابوں کا مطالعہ کرتے اور پھر ان پر تبادلۂ خیال کرتے۔ کلام پاک کی متعدد تفاسیر پڑھنے کی سعادت ہمیں حاصل ہوئی۔ ایک دن مجھے اپنی اصل زندگی کا خیال آیا۔ مجھے یاد آیا کہ میں اس زندگی میں زندگی سے کتنا غیر مطمئن تھا۔ میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ خدا نے میرے ساتھ بے انصافی کی ہے۔ مجھے کبھی کوئی موقع نہیں ملا ورنہ میں زندگی کو بدل کر رکھ دیتا۔ میرے کام ہمیشہ بننے کے بجائے بگڑتے رہے۔ میں ہمیشہ یہی کہتا .... یہی سوچتا رہا کہ اگر ایسا ہو جائے تو .... یا کاش یوں ہو جاتا۔ مگر میرے ساتھ زیادتی ہوئی کہ مجھے کبھی موقع نہیں ملا۔ مجھے یاد آیا کہ اپنی اصل زندگی میں مرتے وقت میں توبہ نہیں کر رہا تھا بلکہ خدا سے شکووں میں مصروف تھا۔

میں نے یہ بات عائشہ کو بتائی تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی، پھر بولی۔ "مرتے وقت میری بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی۔"

ہم دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے سوچتے رہے۔ پھر عائشہ نے کہا۔ "ہم اپنے ری پلے کا سبب تلاش کرتے رہے ہیں۔ ممکن ہے، یہی اس کا سبب ہو۔ خدا نے ہمیں کتنے مواقع عطا فرمائے۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "ہاں .... لیکن اب تک کسی بھی ری پلے میں ہم طمانیت سے نہیں مرے.........."

"مگر اس بار معاملہ مختلف ہے۔ میں اندر سے اتنی مطمئن، خوش اور سرشار ہوں کہ

پہلے کبھی نہیں تھی۔"

"میں بھی۔ یعنی ہمیں معلوم ہو گیا کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت کون لوگ مطمئن ہوتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شکر کی کیا اہمیت ہے۔"

"بے شک لیکن سوال یہ ہے کہ ہمیں پے در پے مواقع کیوں عطا کئے گئے؟ ہم میں ایسی کون سی خوبی تھی؟" عائشہ نے سوال اٹھایا۔

"سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔" میں نے فرش پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "اب سمجھ میں آ گیا ہے کہ انسان کسی عنایت کا مستحق نہیں ہوتا۔ بس اللہ کا رحم و کرم بڑی چیز ہے۔ انسان کو تو بس شکر ادا کرنا چاہئے اپنے رب کا اور اس سے صرف رحم طلب کرنا چاہئے، انصاف نہیں۔" یہ کہتے ہوئے میرے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی۔ مجھے یاد تھا کہ میں خدا سے بے انصافی کا شکوہ کرتا رہا ہوں۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" عائشہ نے کہا۔ "ہم پر تو خصوصی عنایت ہوئی ہے۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا دیا گیا ہے..........."

"اور اب ہم انشاء اللہ اس راستے کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔"

"تمہارے خیال میں ابھی اور ری پلے ہوں گے؟" عائشہ نے پوچھا۔

"خدا ہی جانے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "بہرحال یہ طے ہے کہ اس بار مرتے وقت ہم ساتھ ہوں گے اور سکون سے مر سکیں گے۔"

"انشاء اللہ۔"

اور ۱۸ اکتوبر ۹۳ء کو ہوا بھی یہی۔ میرا وقت آیا تو میرا سر عائشہ کے زانو پر تھا۔ میرے لبوں پر توبہ تھی اور کلمات شکر اور پھر مجھے یاد ہے کہ میں نے کلمہ پڑھا تھا۔

☆----------☆----------☆

میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ طلبا کا بہت بڑا جلوس تھا۔ ایوب خان کے خلاف نعرے لگائے جا رہے تھے۔ میرے ساتھ اخبار کا فوٹو گرافر مراد علی تھا۔ مجھے صورتِ حال کو سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ پھر میں سمجھ گیا۔ وہ یونیورسٹی کا علاقہ تھا اور ایوب خان کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ۶۹ء تھا۔ مہینہ اور تاریخ.......... وہ میں مراد علی سے تو نہیں پوچھ سکتا تھا۔ میں نے کندھے جھٹک دیئے۔ خیر..........

معلوم ہو ہی جائے گا۔ میں مظاہرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اچانک میرے کانوں میں اذان کی آواز آئی۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ وہ ظہر کی نماز کا وقت تھا۔ میں بے چین ہو گیا۔ "میں ابھی آتا ہوں مراد۔" میں نے فوٹو گرافر سے کہا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نماز پڑھ کر آتا ہوں۔"

"یہ نماز کب سے پڑھنے لگے تم؟"

"یہ تو میں.........." میں کہتے کہتے رک گیا۔ "بس ابھی سے شروع کر رہا ہوں۔ خدا کی طرف سے توفیق تو کسی بھی وقت مل سکتی ہے۔" پھر میں اسے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر چل پڑا۔ اذان ابھی جاری تھی۔ میں آواز کی ڈوری پکڑے پکڑے بڑھتا رہا۔ کوئی دو منٹ میں مسجد تک پہنچ گیا۔ وہ کچی مسجد تھی .... جھونپڑی جیسی لیکن اندر قدم رکھتے ہی بے پایاں سکون کا احساس ہوا۔ میں وضو کر کے اندر گیا۔ وہاں چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میں نے فجر کی قضا اور پھر سنتیں پڑھیں۔ سلام پھیرا ہی تھا کہ جماعت کھڑی ہو گئی۔ جماعت میں کوئی بیس کے قریب افراد تھے۔

اس نماز کی لذت میں کیا بیان کروں۔ حضوری کا احساس بے حد توانا تھا۔ لگتا تھا کہ خدا کے دربار میں اس کے حضور کھڑا ہوں۔ میری ٹانگیں کیا، پورا جسم لرز رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں مجسم توبہ بن گیا تھا۔ نماز ختم ہوئی تو میں نے سنتیں اور نفل ادا کئے۔ دو نفل شکرانے کے بھی پڑھے اور اللہ سے راہِ راست پر رہنے کی توفیق کی دعا مانگی۔ اس کے بعد میں دیر تک سر جھکائے شکر، عجز اور ندامت کے آنسو بہاتا رہا۔ پھر مجھے نظروں کی چبھن کا احساس ہوا۔ سر اٹھایا تو سامنے امام صاحب کو بیٹھے دیکھا۔ وہ مجھے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ضعیف آدمی تھے۔ بے حد گھنی اور بے حد سفید داڑھی تھی اور چہرہ اور آنکھیں بے حد روشن تھیں۔

میں تو عجیب کیفیت میں تھا، سلام بھی نہ کر سکا۔ انہوں نے سلام کیا اور آگے بڑھ کر مجھ سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ پھر اچانک انہوں نے میرے ہاتھ کو چوما اور آنکھوں سے لگا لیا۔ میں ششدر رہ گیا۔ میرا جمود ٹوٹ گیا۔ میں نے ہاتھوں کو چھڑانے کی کوشش

کرتے ہوئے کہا۔ "کیا کرتے ہیں مولانا.........."

لیکن انہوں نے میرے ہاتھ نہیں چھوڑے۔ بدستور آنکھوں سے لگائے رہے۔

"مولانا .... آپ مجھ گنہگار کو اور گنہگار کر رہے ہیں.........." میں نے احتجاج کیا۔

"گنہگار کون نہیں ہے میاں لیکن تم تو نصیب والے ہو۔ میرے مالک نے تمہیں عزت دی ہے اور جسے مالک عزت دے، وہ سب کے لئے واجب الاحترام ہوتا ہے۔"

میں نظریں چرانے لگا۔ لگتا تھا، وہ میرے آر پار دیکھ رہے ہیں۔ "میں .... آپ کی بات سمجھا نہیں۔"

"حالانکہ سمجھ گئے ہو۔ خیر .... لفظوں کی کوئی اہمیت بھی نہیں۔ میری دعا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے موقع اور ہدایت سے پوری طرح فیض حاصل کرو۔"

میں ہل کر رہ گیا تھا۔ انہیں سلام کر کے میں مسجد سے نکل آیا۔ مراد علی کے ساتھ میں دفتر پہنچا۔ مگر وہاں بیٹھا نہیں۔ باہر آ کے میں دفتر کے قریب واقع ایک ریسٹورنٹ کے پرائیویٹ کیبن میں جا بیٹھا۔ مجھے سوچنے اور کچھ فیصلے کے لئے تنہائی کی ضرورت تھی۔

☆==========☆==========☆

اس بار ابو سے بہت طویل اور تفصیلی گفتگو ہوئی۔ میں نے بھی ٹھان لیا تھا کہ اس بار اپنی بات منوا کر رہوں گا۔ میں نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ فیکٹری کو بلاتاخیر فروخت کر دیں اور انہیں یہ بھی بتایا کہ میں اپنا اخبار نکالنا چاہتا ہوں۔ روزنامہ سچائی کے ڈکلریشن کی درخواست میں پہلے ہی فائل کر چکا تھا۔

"میں کاروبار کی توسیع کی فکر میں ہوں اور تم کہہ رہے ہو کہ فیکٹری فروخت کر دوں۔" ابو نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ "جہاں تک اخبار کا تعلق ہے، وہ تم یوں بھی نکال سکتے ہو۔ جتنی رقم درکار ہو، مجھ سے لے لو۔ حالانکہ میں اس کے بھی حق میں نہیں ہوں۔ میں تو یہ امید لئے بیٹھا تھا کہ تم میرا ہاتھ بٹاؤ گے۔"

"ابو .... آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ آپ میرے ہی لئے کر رہے ہیں.........."

"اور یہ سچ بھی ہے۔"

"تو پھر مجھے میرے شعبے میں کام کرنے دیں۔"

"میں کب منع کر رہا ہوں۔ تم ضرور اخبار نکالو۔ فیکٹری سے اس کا کیا تعلق؟"

"پلیز ابو، میری بات مان لیں۔ آنے والے وقت میں آپ میرے اس فیصلے کو سراہیں گے۔" میں نے التجا کی۔

"چلیں .... مان جائیں نا!" امی نے ابو سے کہا۔ "ہمارا اپنا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ جو آفاق کی خوشی۔"

بالآخر ابو نے ہتھیار ڈال دیئے۔ فیکٹری فروخت کر دی گئی۔ میں نے دفتر لیا اور اخبار کے سلسلے میں کام شروع کر دیا۔ میں نے پرانے کارکن نہیں لئے بلکہ جرنلزم کی تعلیم حاصل کرنے والے جوانوں کی خدمات حاصل کیں۔ میں اردو صحافت میں ایک نئی بنا ڈالنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ۹۳ء تک بھی اردو اخبارات میں سٹوری تلاش کرنے اور پھر اس کا تعاقب کرنے کی روایت شروع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے تفتیشی، تحقیقاتی رپورٹنگ کا تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

پاکستان میں ٹیلنٹ کی کبھی کمی نہیں رہی۔ مجھے اپنے اخبار کے لئے اہل سٹاف مل گیا۔ میرے تجربے کو سراہا گیا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ اخبار کی اشاعت مسلسل بڑھ رہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ پڑھنے والوں کی ذہنی سطح بھی یقیناً بڑھ رہی ہو گی لیکن حکمرانوں کی پیشانیوں پر بل بڑھتے جا رہے تھے۔ مجھ پر دباؤ بھی ڈالا جاتا تھا۔ مختلف طریقوں سے سزا بھی دی جاتی تھی لیکن باغی رپورٹر کے مقابلے میں باغی پبلشر بہت محفوظ رہتا ہے۔ میں مالی اعتبار سے بہت مستحکم تھا۔ اس لئے ہر دباؤ جھیل سکتا تھا۔ چنانچہ سچائی کا سفر جاری رہا۔

۲۴ جون ۰۷ء آئی اور گزر گئی۔ میں نے وہ سفر کیا ہی نہیں، جس کے دوران مجھے بلقیس سے ملنا تھا۔ میں بلقیس سے نہیں ملنا چاہتا تھا۔ مجھے اس کا حق ہی نہیں تھا۔ اس لئے کہ میں کسی اور کا منتظر تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس انتظار کا کچھ حاصل بھی ہو گا۔ کون جانے، عائشہ کا سائیکل پورا ہو چکا ہو اور اب وہ آئے ہی نہیں۔ مجھے بہرحال اسی کا انتظار تھا۔ وہ اس انوکھے سفر میں میری واحد رفیق تھی۔

سو میں سب کچھ چھوڑ کر اخبار میں جت گیا۔ دوسری طرف اللہ کے فضل و کرم سے پنج وقتہ نماز کا سلسلہ جاری تھا۔ میں بہت مطمئن اور خوش و خرم تھا۔ اخبار کی اشاعت

بہت تیزی سے بڑھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ملک کا سب سے کثیرالاشاعت اخبار بن گیا۔ سرکاری اشتہارات ہمارے بند ہی رہتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ ہمیں اشتہارات کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور اعلان کر دیا کہ ہم سرکاری اشتہارات قبول ہی نہیں کریں گے۔ ۷۴ء اور ۷۶ء میں مجھ پر قاتلانہ حملے ہوئے لیکن اللہ کو زندگی منظور تھی، سو بچ گیا۔

۷۵ء تک میرا اخبار ایک مستحکم ادارہ بن چکا تھا۔ "سچائی" اب ایک بین الاقوامی اخبار تھا۔ اس کا انگریزی ایڈیشن بھی شائع ہوتا تھا۔ ملک کے پانچ بڑے شہروں کے علاوہ اخبار ریاض، شارجہ، لندن اور نیویارک سے بھی شائع ہوتا تھا۔ میرے لئے یہ امر بے حد طمانیت بخش تھا۔ میں نے اس بار مستقبل کی معلومات کو دولت کمانے میں استعمال نہیں کیا تھا۔ میرے پاس جو کچھ بھی تھا، وہ میری صلاحیتوں اور محنت کا صلہ تھا اور وہ کسی اعتبار سے بھی کم نہیں تھا۔

امریکہ میں، میں نے اخبار کا ایک ذیلی دفتر بوسٹن میں قائم کیا تھا۔ اس لئے کہ میں جانتا تھا، عائشہ واپسی کی صورت میں مجھ سے وہیں رابطہ کرنے کی کوشش کرے گی۔ دفتر اسی بلڈنگ میں تھا اور فون نمبر بھی وہی تھا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھے کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔

پھر ایک روز کراچی میں میرے ایک پرائیویٹ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو؟"

"ہیلو آفاق!" اس کی آواز زمانوں کی حدود کے پار سے آتی لگ رہی تھی۔ وہ جانی پہچانی آواز!

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ اس لمحے کا انتظار میں نو سال سے کر رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا اس کے لئے اور اس خدشے کا زہر بھی چپکے چپکے گھونٹ گھونٹ پیتا رہا تھا کہ شاید یہ لمحہ آئے گا ہی نہیں لیکن اب وہ لمحہ آیا تھا اور جیسے میری گویائی ہی لے گیا تھا۔ میں جو سوچتا اور پروگرام بناتا رہا تھا کہ اس سے یہ کہوں گا اور ایسے کہوں گا، وہ سب کچھ کسی دھند میں چھپ گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کوئی پاس بیٹھا ہے کیا؟" پامیلا .... بلکہ عائشہ نے پوچھا۔

"نن .... نہیں۔ کوئی نہیں۔" میں نے بے حد کوشش کر کے کہا۔

"تو پھر؟ یقین نہیں آ رہا ہے؟ حیران ہو؟"

"خوشی سے گنگ ہو گیا ہوں۔ اتنا طویل انتظار!"

"نیویارک آ سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔ سیٹ کنفرم ہوتے ہی تمہیں فون کر کے بتا دوں گا۔ اپنا فون نمبر لکھوا دو۔"

وہ ہچکچائی۔ چند لمحے خاموش رہی۔ پھر وہ بولی۔ "میں خود فون کر لوں گی تمہیں۔ کل .... اسی وقت۔"

رابطہ منقطع ہو گیا۔ مگر میں اب بھی ریسیور ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ خوشی سے میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔ مجھے تو بہت سی باتیں کرنا تھیں۔

ذرا پُرسکون ہوا تو میں نے اس کی ہچکچاہٹ پر غور شروع کیا۔ اس نے اپنا فون نمبر مجھے نہیں دیا تھا۔ کیوں؟ ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔ یہ ۷۸ء تھا۔ وہ واپس آئی ہو گی تو شادی شدہ ہو گی۔ اس کے بچے ہوں گے، میں اداس ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے نیویارک کے سفر کے لئے پیش رفت کی۔ اس کام سے نمٹنے کے بعد اب میرا ایک ہی کام رہ گیا .... عائشہ کی دوسری کال کا انتظار!

اگلے روز اس نے فون کیا تو میں نے اسے بتا دیا کہ میں آ رہا ہوں۔

☆==========☆==========☆

وہ ائرپورٹ پر میری منتظر تھی!

وہی حسن جہاں تاب، وہی سنہری زلفیں، وہی جھیل سی گہری نیلی آنکھیں، وہی قامت زیبا، وہی تمکنت لیکن نہیں .... وہ پہلے جیسی نہیں تھی۔ وہ ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے ہوئے تھی۔ ایک نظر میں معلوم ہو گیا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

میں اس دھچکے کو بیان نہیں کر سکتا، جو اسے دیکھ کر مجھے لگا .... جیسے کوئی شیش محل چکنا چور ہو گیا ہو۔ اس نے دھیمے لہجے میں مجھے ہیلو کہا لیکن میرے ذہن میں تو آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اس صورتِ حال سے وہ بچ نہیں سکتی تھی۔

اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا۔

میں نے ہلٹن میں اپنے قیام کا بندوبست کیا۔ سامان کمرے میں رکھ کر میں باتھ روم میں چلا گیا۔ نہا کر تازہ دم ہو کے میں باہر آیا تو اس جھنجلاہٹ پر قابو پا چکا تھا۔ غسل کے دوران میں خود کو یاد دلاتا رہا تھا کہ یہ وہ ہونی ہے، جو ہو کر رہتی۔ عائشہ اس سے کسی بھی طرح بچ نہیں سکتی تھی۔

کرسی پر بیٹھی عائشہ بے حد پریشان اور پشیمان لگ رہی تھی۔ میں نے اسے ایک حوصلہ افزا مسکراہٹ سے نوازا۔ ”کافی پیو گی؟“

”میں آرڈر دے چکی ہوں۔“ اس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ ویٹر کافی اور سینڈوچ لے آیا تھا۔ عائشہ نے پیالیوں میں کافی انڈیلی اور ایک پیالی میرے سامنے رکھ دی۔ سینڈوچ کی پلیٹ میری طرف کھسکاتے ہوئے وہ بولی۔ ”تمہیں اس بار مجھ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی نا؟“ پھر چند لمحے توقف کر کے اس نے خود ہی جواب دے دیا۔ ”ظاہر ہے، اس صورتِ حال میں کیسے ہو سکتی تھی۔“

میں نے اپنے وجود میں دبی ہوئی تلخی کو پھر سر اٹھاتے محسوس کیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں لیکن شاک لگنا تو قدرتی امر تھا۔“ پھر میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ ”تم عائشہ ہی ہو نا؟“

اس بار اس کے چہرے پر ناراضی نظر آئی۔ ”تو اور کیا۔“ اس نے کہا۔ ”پامیلا سے عائشہ بنتے ہی میں نے تمہیں فون کیا تھا۔“

”شکر ہے خدا کا۔“ میں نے سچائی سے کہا۔ ”میں اپنے ردِ عمل پر شرمندہ ہوں۔ تم جانتی ہو کہ میں تمہاری پوزیشن سمجھ سکتا ہوں“۔

”خدا کا شکر ہے۔“ اس نے بھی نرم لہجے میں کہا۔ ”تم کیوں شرمندہ ہوتے ہو۔ تم تصور نہیں کر سکتے کہ اس بار واپس آتے ہی مجھ پر کیا گزری ہے۔ اپنا آپ برا لگ رہا تھا۔ پہلے میں نے سوچا، ان تمام مرحلوں سے گزر کر تم سے ملوں گی لیکن میرے لئے ایک لمحہ برداشت کرنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ میں کم ظرف تھی، ہار گئی ورنہ مجھے چار ماہ بعد تم سے رابطہ کرنا تھا۔“

”تم نے اچھا کیا کہ فوراً ہی رابطہ کر لیا۔“ میں نے کہا۔ حالانکہ میں نے دل میں سوچا تھا کہ کاش وہ انتظار کر ہی لیتی۔ میں اس اذیت سے بچ جاتا۔ ”تفصیل نہیں بتاؤ گی۔“ میں نے کہا۔

”میں نیوراکیل میں بچوں کے کپڑوں کی دکان میں تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”میرا تین سالہ بیٹا کرسٹوفر میرے ساتھ تھا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ..........“ اس کی نظریں اپنے پیٹ کی طرف جھکیں۔ ”یہ میرے لئے بہت بڑا جذباتی صدمہ تھا۔ میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی۔ میں نے سسکنا شروع کر دیا۔ مجھے خود پر بالکل قابو نہیں تھا۔ کرسٹوفر خوفزدہ ہو گیا۔ وہ رونے لگا..........“ اس کی آواز ٹوٹنے لگی۔ آنکھیں چھلکنے لگیں۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور تھپتھپانے لگا۔ ذرا دیر بعد وہ سنبھلی اور اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ”یہ میرے پیٹ میں وہ بیٹی ہے، جس کا نام اصل زندگی میں میں نے کمبرلی رکھا تھا۔ اسے مارچ میں پیدا ہونا ہے.......... ۱۸ مارچ ۷۹ء کو۔ آفاق .... میں اپنے بچوں سے پہلے سے زیادہ محبت کرتی ہوں۔ مگر..........“ وہ پھر رونے لگی۔

میں اس کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔ ایک بیٹی تو میں نے بھی وقت کے اس پھیر میں گنوائی تھی۔

ذرا دیر بعد عائشہ نے پھر خود کو سنبھالا۔ ”تم اپنی سناؤ۔“ اس نے کہا۔

”میں اس بار پاکستان میں تھا ۶۹ء تھا۔“

”تمہاری بیوی بلقیس؟“

میں نے جواب دینے کے بجائے صرف سر کی جنبش سے کام لیا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ”خوش ہو؟“

”ہاں، اللہ کا شکر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے اس بار موقع ملنے کے بعد اچھی زندگی گزارنے کی کوشش کی ہے۔ روزہ، نماز .... اور اس بار میں نے مستقبل کی معلومات سے دولت بھی نہیں کمائی۔ میرا اخبار..........“

”میں جانتی ہوں۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”میں نے بوسٹن فون کیا تھا۔ وہاں سے تمہارا پرائیویٹ نمبر لیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم اپنے اخبار کے ذریعے ایک بڑا کام کر رہے ہو۔“

"اب اس بار صورتِ حال مختلف ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہارا اشارہ میرے شوہر اور بچوں کی طرف ہے؟" اس کی نظریں جھک گئیں

"ہاں.......... اس بار معاملہ بہت مختلف ہے۔"

"تم اس سے محبت کرتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس طرح نہیں، جیسے تم بلقیس سے محبت کرتے ہو۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

مجھے اچانک احساس ہوا کہ بلقیس کے بارے میں جو میں نے سر کی جنبش سے جواب دیا تھا وہ اسے غلط سمجھی ہے۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ میں نے بلقیس سے شادی کرلی ہے۔ "اور میں اسٹیو سے کیسے محبت کر سکتی ہوں؟" کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔ "جب کہ میں مسلمان ہوں۔ البتہ بچوں کا معاملہ مختلف ہے۔ ان کی فکر ہے مجھے۔ کرسٹوفر صرف تین سال کا ہے اور بیٹی ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی ہے۔ ان کا کیا کروں میں؟" پھر اچانک اس کی آنکھوں میں برہمی چمکی۔ "اور مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ تمہارے پاس میری گنجائش ہے بھی یا نہیں۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے عائشہ۔" میں نے کہا۔ "میں نے اب تک شادی نہیں کی ہے۔ کر ہی نہیں سکتا۔ تمہارے بارے میں، میں جیسا محسوس کرتا ہوں، اس کے بعد کسی اور سے شادی کی گنجائش ہی نہیں۔ میں تو بس تمہارا انتظار کر سکتا ہوں۔"

وہ ایک دم شرمندہ نظر آنے لگی۔ بولی تو اس کے لہجے میں محبت تھی۔ "تم نے میرے لئے اتنی بڑی قربانی دی اور میں تم پر شک کر رہی تھی۔"

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ میرا ری پلے ۶۹ء میں شروع ہوا تو میں غیر شادی شدہ تھا۔ پھر میں شادی کیوں کرتا۔" اتنا کہہ کر میں نے ایک گہری سانس لی۔ "لیکن اگر آئندہ بھی ری پلے ہوا تو میں بھی یقیناً شادی شدہ ہوں گا۔"

"یہ بعد کا مسئلہ ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مگر فوراً ہی سنجیدہ ہو گئی۔ "اس وقت مسئلہ میں ہوں۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ حالانکہ مسئلہ سیدھا سا ہے۔ تمہارے مسلمان ہوتے ہی اسٹیو سے تمہاری شادی کی قانونی حیثیت ختم ہو جائے گی۔"

"جانتی ہوں میں لیکن مسئلہ بچوں کا ہے۔"

"بچوں سے زیادہ یہ تمہاری آخرت کا مسئلہ ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا اور وہ کپکپا کر رہ گئی۔ "مسلمان عورت ہونے کے ناطے تم اپنے غیر مسلم شوہر کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یعنی مجھے بچوں کی قربانی دینی پڑے گی۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ جانتا تھا کہ وہ اس کے لئے ایک سنگین مسئلہ ہے۔ بہتر یہی تھا کہ وہ خود اس پر سوچے اور فیصلہ کرے۔

"بچی کی پیدائش تک تو میں کچھ نہیں کر سکتی۔" ذرا دیر بعد وہ بولی۔ "تین ماہ بعد میں تمہارے ساتھ پاکستان چلوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اب میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا "اور سناؤ .... اب تک کیا کچھ کرتی رہی ہو تم؟"

"سناؤں گی نہیں، دکھاؤں گی۔ کل میری تصویروں کی نمائش شروع ہو رہی ہے۔ تمہیں آنا ہے اس میں۔ دعوت نامہ لائی ہوں۔"

ہمارے درمیان دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

☆==========☆==========☆

میں ہاتھورن گیلری میں داخل ہوا۔ استقبالیہ حصے میں ایک خمیدہ میز تھی۔ اس کے سامنے ایک خوبصورت چرمی صوفہ تھا۔ "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" استقبالیہ کلرک نے کہا۔

میں نے عائشہ کا دیا ہوا دعوت نامہ اس کی طرف بڑھایا۔ "میں یہاں افتتاح میں شرکت کے لئے آیا ہوں۔"

کلرک نے ایک لسٹ نکالی اور میرا نام تلاش کر کے اس کے سامنے نشان لگا دیا۔ پھر خوش خلقی سے بولی۔ "آپ اندر تشریف لے جائیں۔"

میں مرکزی گیلری میں داخل ہوا۔ وہ بہت بڑا کمرہ تھا۔ اس کو تصویروں کے لحاظ سے کئی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک طرف بڑی تصویریں تھیں۔ گیلری میں بیس فٹ کا ایک کینوس سب سے نمایاں تھا۔ اس میں سمندر کے نیچے کا ایک منظر تھا، جو صرف آرٹسٹ کے ذہن میں .... اس کے تخیل میں رہا ہو گا۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق

نہیں تھا۔ مہیب موجوں کے نیچے سے ایک پہاڑ کی پُرسکون چوٹی جھانکتی نظر آ رہی تھی۔ چوٹی پر جمی ہوئی برف کا سمندر کی موجیں بھی کچھ نہیں بگاڑ سکی تھیں۔ پہاڑ کی نچلی دراڑوں کے درمیان ڈولفین مچھلیوں کا ایک غول تیرتا نظر آ رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس غول میں دو ایسی مچھلیاں نظر آئیں، جو عمر اور وقت سے بے نیاز معلوم ہوتی تھیں اور ان کی آنکھیں.........! وہ واضح طور پر انسانی آنکھیں تھیں۔

"مجھے خوشی ہوئی کہ تم آئے۔" عقب سے عائشہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ "کیسے نہ آتا۔"

دوستانہ نقوش والے چہرے کا ایک شخص چشمہ لگائے اسی طرف چلا آیا۔ "اسٹیو .... یہ ہیں میرے بہت پرانے دوست مسٹر عباسی۔" عائشہ نے تعارف کرایا۔ "اور یہ میرے شوہر اسٹیو رابسن۔"

میں نے اسٹیو سے ہاتھ ملایا۔ وہ خوش دلی سے مسکرا رہا تھا۔

عائشہ نے مجھے تین سالہ کرسٹوفر سے ملایا۔ بہت پیارا بچہ تھا وہ۔ پھر پوری نمائش اس نے خود مجھے دکھائی۔ بعض تصویروں میں میرے اور اس کے مشترکہ ماضی کی جھلک بے حد نمایاں تھی۔ میں رخصت ہونے لگا تو اس نے سرگوشی میں کہا۔ "میں کل گیارہ بجے تمہارے ہوٹل آؤں گی۔"

اگلے روز وہ ہوٹل آئی۔ ہمارے درمیان صرف مستقبل کے حوالے سے باتیں ہوئیں۔ لائحہ عمل طے ہوا۔ طے پایا کہ میں پہلی فرصت میں پاکستان واپس چلا جاؤں گا اور اب ہماری ملاقات پاکستان میں ہی ہو گی۔ اس کے بعد ہم مرنے تک جدا نہ ہوں گے۔

اس کے لئے مجھے مارچ ۷۹ء تک انتظار کرنا پڑا۔ اپریل میں ہماری شادی ہوئی۔ ابو اور امی بہت خوش تھے۔ عائشہ انہیں بہت اچھی لگی تھی۔ پہلے تو میری شخصیت کے انقلاب نے ہی انہیں خوش کر دیا تھا اور اب میری امریکی نژاد بیوی انہیں حیران کر رہی تھی۔ وہ نہ صرف پابند صوم و صلوٰۃ تھی بلکہ اس کی دین کی سمجھ ان کے لئے حیران کن تھی۔ مختصر یہ کہ اس بار ہم بے حد مطمئن اور مثالی زندگی گزار رہے تھے۔ اسٹیو رابسن اچھا انسان ثابت ہوا تھا۔ تین سال بعد سے اس نے ہر سال ایک معمول پر عمل کیا تھا۔ وہ دونوں بچوں کو ماں سے ملوانے کے لئے پاکستان بھیجتا تھا۔ دونوں بچے یہاں بہت خوش

رہتے، بہت اچھا وقت گزارتے۔

زندگی کا وہ عرصہ بہت بھرپور عرصہ تھا۔ میرا اخبار ایک ایسا مستحکم ادارہ بن چکا تھا کہ اب میری موجودگی کے بغیر بھی اپنے مخصوص انداز میں چل سکتا تھا۔ مخلص اور سچے کارکنوں کی ایک مضبوط ٹیم اسے میسر تھی۔ چنانچہ میں بڑی بے فکری کے ساتھ اخبار سے دور ہوتا گیا۔ مجھے عائشہ کے ساتھ مل کر اور بہت کچھ کرنا تھا۔ سو میں نے اور عائشہ نے ایک رفاہی ادارے کی داغ بیل ڈالی۔ ابھی تک ہم صرف عبادت کرتے رہے تھے لیکن خدمتِ خلق کا قرض ہم پر باقی تھا۔

اپنے خول سے باہر نکلنے میں ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسانیت پر انسان کا اعتماد بحال ہو جاتا ہے۔ خول میں بند ہوں تو صرف ایسے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے جو غرض کے بندے ہوتے ہیں .... اور آدمی دنیا کو برا بھلا کہنے لگتا ہے۔ یہ برا کہنا اور برا سمجھنا اس کے باطن پر اچھا اثر نہیں چھوڑتا۔ جو شخص اپنے ماحول سے شاکی ہو گا اور اس کی برائی پر پختہ یقین رکھتا ہو گا وہ اچھا انسان ہونے کے باوجود اچھا انسان کیسے بن سکتا ہے۔ پہلے اخبار نکالنے کے تجربے نے مجھے اعتماد بخشا تھا کہ دنیا میں اچھے اور مخلص انسانوں کی کمی نہیں اور رفاہی ادارے نے تو اس یقین کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ اتنے اچھے اور انسانوں کا درد رکھنے والے لوگ سامنے آئے کہ ہم حیران رہ گئے۔

میں نے ایک ٹرسٹ قائم کر دیا تھا۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ سب سے بڑی نیکی ایک بھوکے انسان کو عزت کے ساتھ پیٹ بھر کر کھانا کھلانا ہے۔ اس خیال کے پیشِ نظر سب سے پہلے میں نے شہر میں ایک لنگر قائم کیا۔ وہاں کوئی بھی شخص بلا تفریق آ کر کھانا طلب کر سکتا تھا۔ ابتدا میں تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑے لیکن نیکی بہرحال رنگ لاتی ہے۔ کچھ دن بعد یہ صورتِ حال ہوئی کہ وہاں صرف وہی لوگ آتے تھے، جو صحیح معنوں میں ضرورت مند ہوتے تھے۔ دوسرا مرحلہ ایک ہسپتال کے قیام کا تھا۔ اس کے اور دیگر رفاہی کاموں کے سلسلے میں ہم نے یہ زیادہ مناسب سمجھا کہ اسے عبدالستار ایدھی صاحب کے سپرد کر دیا جائے۔ وہ ہم سے بہت پہلے سے ہمارے مقابلے میں بہت بڑے کام کر رہے تھے۔

دنیا میں انسانوں کے دکھ اتنے ہیں کہ اگر کوئی مداوا نہیں، ان کی پرسش بھی شروع

کرے تو پتہ بھی نہ چلے اور عمر تمام ہو جائے۔ ہمیں دن چھوٹا پڑ جاتا تھا اور رات کو بے سُدھ ہو کر ایسی مطمئن نیند سوتے جو پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ کام کے اس سحر سے پہلی بار ہمیں ۸۸ء میں ابو کے اور پھر امی کے انتقال نے چونکایا۔ مگر پھر وقت اسی طرح بہنے لگا۔ یہاں تک کہ ۹۳ء شروع ہو گیا۔ اب ہمیں خود اپنے کام نمٹانے کی فکر کرنا تھی۔ اس کے بعد اپنے لئے وقت نکالنا تھا۔ اس بار کئی مسائل پر تبادلۂ خیال کرنا تھا۔

پہلے مرحلے میں قانونی بکھیڑے تھے۔ وصیت مرتب کرنا تھی .... اس اعتبار سے کہ اخبار بھی جاری رہے اور ہمارا رفاہی ادارہ تو پہلے ہی ٹرسٹ کی شکل میں تھا۔ اخبار کو بھی ہم نے اسی ٹرسٹ میں دے دیا۔ خوش قسمتی سے ہمیں قابلِ اعتبار افراد میسر تھے۔ اس معاملے سے نمٹنے میں تین ماہ لگ گئے۔

اپریل میں ہم نے مانسہرہ میں وہی زمین لی اور اپنے لئے کاٹیج بنوایا، جہاں ایک ری پلے میں ہم نے زندگی کے آخری ایام گزارے تھے۔ پھر ہم وہاں منتقل ہو گئے۔ میں نے چھ ماہ کی ضروری اجناس خرید لی تھیں۔ دودھ اور انڈوں کے لئے ہم نے بکریاں اور مرغیاں پال لیں۔ اب ہم باہر کی دنیا سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

وہ دن اپنی ذات کو ٹٹولنے، کھنگالنے اور آپ اپنا احتساب کرنے کے تھے، ہم جانتے تھے کہ اللہ کی رحمت ہی انسان کی بخشش کا سامان ہوتی ہے ورنہ اللہ خود انسان کو کبھی خسارے میں قرار نہ دیتا۔ ہم یومِ حساب سے خائف تھے اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے تھے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس بار کوئی پچھتاوا لاحق نہیں تھا۔ ہم نے زندگی سے، اللہ کی دی ہوئی بے شمار نعمتوں سے، جن میں اس کی دی ہوئی بے بہا مہلت بھی تھی، بھرپور استفادہ کیا تھا۔ ہم آخرت سے خوفزدہ لیکن بہرحال مطمئن تھے۔

البتہ ایک ذاتی خوف بھی تھا، جس پر ہمارے درمیان گفتگو ہوتی تھی۔ کون جانے ہمیں ایک بار پھر اسی زندگی سے گزرنا پڑے۔ ہم دونوں ہی ایسا نہیں چاہتے تھے لیکن اس پر ہمارا کچھ اختیار نہیں تھا۔ لہٰذا یہ خدشہ اپنی جگہ موجود تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

"ایسا ہوا تو امکان یہی ہے کہ اب میرا ری پلے اور تاخیر سے شروع ہو گا........."
میں نے عائشہ سے کہا۔

"اور مجھے اپنے بارے میں یقین ہے کہ میں ۹۰ء کی دہائی میں ہی واپس آؤں گی۔"
وہ بولی۔

"اور یہ بہت پیچیدہ صورتِ حال ہو گی۔ میں اس بار ابو کو مالی نقصان سے نہیں بچا سکوں گا۔ دوسرے لفظوں میں مجھے مالی مشکلات کا سامنا ہو گا۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔ لیکن........."

"نہیں!" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ "اب میں شرطوں یا سرمایہ کاری کے ذریعے دولت کما کر اب تک کے کئے کرائے پر پانی تو نہیں پھیر سکتا۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" عائشہ نے کہا۔ "اور اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ کم از کم ایک ری پلے اور ہو گا۔ اللہ نے اتنی عنایات ہم پر کیں تو اپنی زندگی کے سخت ترین عرصے دوبارہ گزاریں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اتنی اصلاح کے بعد ہم اس عرصے سے کیسے گزرتے ہیں۔"

میں لرز کر رہ گیا۔ "ہم اللہ سے اچھی توفیق ہی طلب کر سکتے ہیں۔"

ہمارے درمیان اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ دونوں کے پاس قیاسات کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پھر وہ دن بھی آ گیا .... ۱۸ اکتوبر ۹۳ء صبح ناشتے کے بعد بھی ہم دونوں میز پر بیٹھے رہے۔ ہم ایک دوسرے کو چپکے چپکے دیکھ رہے اور نظریں ملنے پر نظریں چرا رہے تھے۔ اچانک عائشہ نے کہا۔ "میں تمہارے اس عہد کے اصل ٹھکانے یعنی تمہارے فلیٹ سے باخبر ہوں۔ مجھے تمہارے فلیٹ کا فون نمبر بھی یاد ہے۔"

میں اس کی بات سمجھ گیا۔ ہم دونوں کو ہی ایک دوسرے کے اصل پتے کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ "تم مجھے اسٹیو رابسن کا پتا اور فون نمبر یاد کرا دو۔"

اس نے مجھے پتہ اور فون نمبر بتایا۔ میں اسے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کبھی میں سر اٹھا کر اسے دیکھتا تو اسے محبت اور یاس بھری نظروں سے خود کو تکتا پاتا۔ وہ فوراً ہی نظریں جھکا لیتی اور کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتی۔ تب میں اسے تکتا رہتا۔ یونہی جیسے صدیاں بیت گئیں۔ پھر کلاک کی آواز نے ہمیں چونکایا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ساڑھے بارہ بجے تھے۔

"ساڑھے بارہ بج گئے۔ وقت قریب آگیا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر اس کی پلکیں نم ہونے لگیں۔ "ہاں .... جدائی کی گھڑی........."

"عائشہ .... آنکھوں میں آنسو نہ آنے دو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "یہ شکر کا مقام ہے۔ خدا نے ہمیں ایسا وقت دیا ہے کہ ہم نماز پڑھتے ہوئے اس کے حکم پر جان دیں گے۔"

عائشہ نے جھٹکے سے ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھے اور مسکرا دی۔ "واقعی .... انسان کتنا ناشکرا ہوتا ہے۔" اس کے لہجے میں پشیمانی تھی۔

ہم چند منٹ ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ ہماری نظروں میں ایک دوسرے کے لئے سبھی کچھ تھا .... محبت، وارفتگی، ستائش اور شکر گزاری۔ پھر ہم ایک ساتھ اٹھے۔ وضو کر کے ہم آئے تو ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ "الوداع آفاق۔" عائشہ نے کہا۔

"الوداع عائشہ۔"

ہم الگ الگ کمروں میں چلے گئے۔ یہ اللہ کی دی ہوئی سعادت ہے کہ ایک بج کر چھ منٹ پر میرے سینے میں درد اٹھا تو میں فرض نماز ادا کر رہا تھا اور سجدے میں تھا۔

☆==========☆==========☆

اس بار میں اپنے فلیٹ میں تھا۔ میری بیوی بلقیس میرے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ تلخ لہجے میں کہہ رہی تھی "......... لیکن تمہیں تو احساس ہی نہیں ہے۔" اس سے پہلے اس نے جو کچھ کہا ہو گا، وہ میں نے نہیں سنا تھا۔ مجھے سنبھلنے کے لئے مہلت درکار تھی۔

"سوری بلقیس!" میں نے کہا۔

"تمہیں پرواہ ہی نہیں ہوتی کسی بات کی۔"

"کیا ہو گیا ڈیئر!" میں نے خودکار انداز میں پوچھا۔

"تو تم نے میری بات سنی ہی نہیں۔" وہ اور برہم ہو گئی۔ "تم میری بات پر کبھی توجہ ہی نہیں دیتے۔ میں کہہ رہی تھی کہ........."

اسی وقت عشاء کی اذان کی آواز سنائی دی۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوا۔ "پھر بات کریں

گے۔ میں نماز پڑھ آؤں۔"

بلقیس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر زہریلے لہجے میں بولی۔ "تمہیں شرم آنی چاہئے۔ اب میری بات سننے سے بچنے کے لئے نماز کا بہانہ بھی کرنے لگے۔"

"بہانہ نہیں۔ میں سچ مچ نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔" میں نے بے حد تحمل سے کہا۔

"ایسے کہہ رہے ہو، جیسے پنج وقتہ نمازی ہو۔"

"نہیں ہوں لیکن انشاء اللہ اس وقت سے ہو جاؤں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ .... کبھی جمعہ پڑھنے کی تو توفیق ہوتی نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

میں اسے نظرانداز کر کے فلیٹ سے نکل آیا۔ مسجد کے دروازے پر ایک شخص چادر بچھائے بیٹھا تھا۔ چادر پر ٹوپیاں، مسواک اور تسبیحیاں رکھی تھیں۔ میں نے پہلے جیب ٹٹولی کہ پیسے ہیں بھی یا نہیں۔ پھر ایک ٹوپی خرید لی۔ اندر داخل ہو کر میں نے جلدی سے وضو کیا۔ مغرب کی قضا بھی پڑھنا تھی۔

نماز پڑھ کر باہر نکلا تو میں نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ گھر پہنچا تو بلقیس نے مجھے غور سے دیکھا۔ "تو سچ مچ نماز پڑھنے گئے تھے۔"

"کیا مطلب؟"

"ایک ہی نماز میں پیشانی پر محراب بھی بنا آئے ہو۔ کیا سجدے میں سر پٹختے رہے ہو۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو بات سمجھ میں آ گئی۔ "یہ تو اللہ کی دین ہے۔ تم بھی مانگ لو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم بھی چاہو تو ابھی جا کر ماتھے پر یہ محراب سجا آؤ۔"

"شکریہ۔ مجھے ایسی ضرورت نہیں۔" اس نے تند لہجے میں کہا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔

اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ہاں اب فرصت ہو گئی ہو تو میری بات بھی سن لو۔ میں کہہ رہی تھی کہ تمہیں ذرا بھی احساس نہیں کہ........."

زندگی شروع ہو گئی تھی!

☆==========☆=====-====☆

پہلے .... میرا مطلب ہے کہ اصل زندگی میں میرا خیال تھا کہ ہماری ازدواجی زندگی مالی پریشانیوں کی وجہ سے خراب ہے لیکن اس ری پلے نے تمام پردے اٹھا دیئے۔

اصل زندگی میں میری ازدواجی زندگی خوشگوار ہرگز نہیں تھی لیکن اس قدر تلخ اور تباہ بھی نہیں تھی، جتنی اب ہو گئی تھی۔ وہ پہلا دن ایک پیٹرن تھا، جس پر زندگی آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا.......... سوائے میرے اور میرے اندر ہونے والی تبدیلی بلقیس کو راس نہیں آئی تھی۔ میری دین داری نے اسے اور تلخ اور زہریلا بنا دیا تھا۔ اس کی زبان ہروقت زہر اگلتی رہتی۔ نماز کے حوالے سے اٹھتے بیٹھتے وہ مجھے طعنے دیتی لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے عجیب صبر اور طمانیت عطا فرما دی تھی۔ میں اس کی بڑی سے بڑی بات پر بھی نہ جھنجلا کر، مسکراتا اور چپ رہتا۔ یہ بات شاید اسے اور مشتعل کر دیتی۔

اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ طبعاً اچھی عورت نہیں تھی۔ اصل زندگی میں وہ ناخوش رہی تھی لیکن اتنی بدتمیز نہیں تھی۔ شاید میری دین کی طرف رغبت نے اس کی اصلیت کو ابھار دیا تھا۔ ہروقت وہ مجھ سے کوئی نہ کوئی شکوہ کرتی۔ زبان اس کی بہت خراب ہو گئی تھی.......... ایسی کہ میں تصور میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔

اس بار میرا ری پلے ۸۸ء کے دسمبر میں شروع ہوا تھا۔ میں بلقیس کے رویے کو اس لئے بھی برداشت کر رہا تھا کہ صرف پانچ سال کی تو بات ہے لیکن معاملہ الٹا ہوا۔ خود میں بلقیس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ اس نے مجھ سے ضد شروع کر دی کہ جاب کرے گی۔ یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ بات اس حد تک بڑھی کہ ۹۲ء میں وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ جاتے وقت اس نے ایک ہزار روپے کا ایک پرائز بانڈ عملاً میرے منہ پر دے مارا "تم نے زندگی میں مجھے دیا کیا ہے!" اس نے چلا کر کہا تھا اور یہ ہے تمہاری عمر بھر کی بچت۔ سنبھال کر رکھو اسے۔"

تین دن بعد مجھے عدالت سے نوٹس موصول ہو گیا۔ ۹۲ء میں ہی ہمارے درمیان علیحدگی ہو گئی۔ میرے لئے وہ خوشگوار تبدیلی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ میری زندگی معمولات کے تحت چلتی رہی۔ اب قسمت کی بات

دیکھئے کہ ۹۳ء میں میرے اس پرائز بانڈ پر پہلا انعام نکل آیا، یہ بلقیس نے میرے منہ پر دے مارا تھا۔ انعام نکلتے ہی میں نے آدھی رقم یعنی ڈھائی لاکھ روپے بلقیس کو دے دیئے۔ اس کے ماضی کی بدحالی کی میں اسی طرح تلافی کر سکتا تھا۔

ستمبر ۹۳ء میں مجھے عائشہ کا خیال آیا تو مجھے حیرت ہوئی۔ اس ری پلے میں اب تک مجھے اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس کی یاد آئی تو میں بے تاب ہو گیا۔ پرائز بانڈ کے انعام میں ملنے والی نصف رقم خوش قسمتی سے میرے پاس موجود تھی۔ لہٰذا کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور میں زندگی کا آخری ماہ گزارنے کے لئے نیویارک روانہ ہو گیا۔

☆==========☆==========☆

میں مین ہٹن کے ریلوے سٹیشن پر پامیلا کا منتظر تھا۔ پامیلا اس لئے کہ مجھے یقین تھا، ابھی وہ عائشہ نہیں بنی ہے۔ نیویارک پہنچتے ہی میں نے ایک ڈی ٹیکٹو ایجنسی سے رابطہ کیا تھا۔ دو ہفتے بعد انہوں نے مجھے اطلاع دی تھی کہ پامیلا ہر پیر کو ٹرین کے ذریعے مین ہٹن جاتی ہے۔ وہاں آرٹ گیلریاں اور میوزیم اس کی توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔

گیارہ بجے والی ٹرین آئی تو اس میں سے زیادہ تر عورتیں ہی اتریں۔ پامیلا سب سے آخر میں تھی اور میں نے تقریباً اسے مس کر دیا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت تک میں نے یہ سوچ کر فکرمند ہونا شروع کر دیا تھا کہ شاید مجھے درست معلومات فراہم نہیں کی گئی ہیں۔

بہرحال وہ مجھے نظر آ گئی۔ میں تیس قدم کا فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ مسافروں کی بھیڑ کے باوجود اس میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کیونکہ اپنے دراز قد اور سنہرے بالوں کی وجہ سے وہ بے حد نمایاں تھی۔ وہ سٹیشن سے ۴۵ ویں مشرقی سٹریٹ پر نکلی اور پارک ایونیو کی طرف چل دی۔ میڈیسن سے گزر کر وہ ففتھ پر پہنچی اور پھر شمال کی طرف مڑ گئی۔ سارک اینڈ کارٹیئر کی ونڈو کے سامنے وہ چند لمحوں کے لئے رکی پھر آگے بڑھ گئی۔ ۵۳ ویں سٹریٹ پر وہ مغرب کی طرف مڑی اور میوزیم آف ماڈرن آرٹ میں داخل ہو گئی۔

میں نے داخلے کا ٹکٹ لیا اور اندر داخل ہوا تو میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئی تھیں۔ فی الوقت وہ میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

میں نے اس کو صرف دور سے دیکھنے کے لئے کتنے پاپڑ بیلے تھے۔ جبکہ میں جانتا تھا کہ وہ میری عائشہ نہیں ہے اور شاید کبھی بن بھی نہیں سکے گی لیکن پھر بھی مجھے اس کی آنکھوں میں جھانکنے اور وہاں شناسائی دیکھنے کی اور قریب سے اس کی آواز سننے کی آرزو تھی۔ یہی آرزو مجھے اس کے تعاقب میں لے آئی تھی۔

میں نے پہلے لابی میں دیکھا کہ شاید وہ بک سٹال سے کوئی میگزین یا اخبار خریدنے کے لئے رک گئی ہو لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ میں لابی سے گزر کر پہلی منزل کی گیلریوں میں گیا اور پھر خود کار زینوں کی مدد سے اوپر چلا گیا۔ وہ دوسری منزل پر بھی نہیں تھی۔ تیسری منزل پر بالآخر وہ نظر آ گئی۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بہت غور سے سیرا کے بنائے ہوئے مجسموں کو دیکھ رہی تھی۔ میں اس سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ میرا جسم شدت جذبات سے شل ہو رہا تھا۔ تصور میں وہ یادیں تھرک رہی تھیں، جن میں وہ میرے ساتھ تھی۔

اچانک غیر متوقع طور پر وہ میری طرف پلٹی۔ "کیسا لگا آپ کو؟"

میں اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ گفتگو کا آغاز کر بیٹھے گی اور اب وہ نیلی جھیلوں جیسی جانی پہچانی آنکھیں میری طرف نگراں تھیں۔ نہیں، .... میں نے خود کو یاد دلایا۔ یہ وہ جانی پہچانی آنکھیں نہیں ہیں۔ یہ اس مانوس روح کی جانب کھلنے والے دریچے نہیں ہیں۔ یہ تو اجنبی پامیلا ہے۔

"میں پوچھ رہی ہوں کہ سیرا کے فن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" اس نے پھر کہا۔

آرٹ پر تبصرے سے ہمارے درمیان گفتگو کا آغاز ہوا لیکن میں اپنی توجہ گفتگو پر مرکوز نہیں کر پا رہا تھا۔ کیسی عجیب اور ناقابلِ یقین بات تھی کہ میں نے کئی بار اس کے ساتھ زندگی گزاری تھی۔ اس کے ساتھ مل کر بہت کچھ کیا تھا اور اب ایک اجنبی کی حیثیت سے اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا۔

وہ باتیں کرتی رہی۔ ذرا دیر میں ہم گھل مل گئے۔ میں سب کچھ بھول کر اس کے ساتھ ہنسنے بولنے میں گم ہو گیا۔ میں نے اسے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی، جو اس نے ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد قبول کر لی۔

کھانے کے دوران وہ مجھے اپنے متعلق بتاتی رہی .... اپنی محرومیوں کے متعلق۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ تصویریں بناتی تھی لیکن پھر اسے اپنے شوق سے دستبردار ہونا پڑا۔ اب زندگی اسے ایک ایسے خلا کی طرح محسوس ہوتی ہے، جسے وہ بھر نہیں سکتی۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اب تک کیا کیا کچھ کر چکی ہے لیکن میں نے بڑی کوشش سے خود کو باز رکھا۔

ہم کافی پی چکے تو میں نے کہا۔ "ہم نے بہت اچھا وقت گزارا ہے .... بے حد خوشگوار۔"

"ہاں۔ میں تمہاری شکر گذار ہوں۔"

"تم یہاں آتی رہتی ہو؟"

"ہر پیر کو۔"

"تو پھر کیوں نہ..........." میں کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"ہم آئندہ بھی ساتھ وقت گزار سکتے ہیں........... ساتھ لنچ کر سکتے ہیں۔"

وہ چند لمحے اپنی انگلیاں مروڑتی رہی، پھر بولی۔ "تم جانتے ہو کہ میں شادی شدہ ہوں۔"

"جانتا ہوں!"

"اور میں........... میں کوئی ایسی ویسی .... میرا مطلب ہے کہ..........."

"میں یہ بھی جانتا ہوں۔" میں مسکرایا اور میں نے کاغذ کا نیپکن اس کی طرف بڑھایا

"یہ لو۔"

"کس لئے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"چھوٹے چھوٹے پرزے کرنے کے لئے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ اچانک اس نے مجھے الجھن بھری نظروں سے دیکھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہے کہ میں کسی کشمکش میں ہوتی ہوں تو نیپکن کے پرزے کرتی رہتی ہوں؟"

"پتہ نہیں کیسے لیکن مجھے معلوم ہے۔ لگتا ہے، میں بہت کچھ جانتا ہوں تمہارے بارے میں۔"

وہ خاموش رہی پھر بولی۔ "اگلی پیر کو میں گگن ہیم میں آؤں گی۔"

☆==========☆==========☆

اگلی پیر کو بھی ہم ملے اور ہم نے بہت اچھا وقت گزارا۔ بے تکلفی اور بڑھ گئی تھی۔ مجھے علم تھا کہ آئندہ پیر ہمارا آخری دن ہے .... ۱۸ اکتوبر ۹۳ء۔ پاملیا نے بتایا کہ اگلے پیر کو وہ نہیں آئے گی۔ میں یہ بات جانتا تھا کہ اسے اصل میں اپنے گھر پر مرنا ہے لیکن میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسے آنے پر بھی منالیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ یہاں گھومنے کے بجائے میں اسے اپنے گھر لے چلوں گا۔

یہ سن کر وہ چونکی اور میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ "سنو، کہیں تم..........؟"

"مجھ پر اعتماد کرو۔ میں بھی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ پھر مطمئن نظر آنے لگی۔ "ٹھیک ہے۔ گیارہ بجے سٹیشن پر ملیں گے۔"

پیر ۱۸ اکتوبر ۹۳ء کو ساڑھے گیارہ بجے اس اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے، جو میں نے نیویارک پہنچتے ہی کرائے پر لیا تھا۔ میرے پاس ڈیڑھ گھنٹے کی مہلت تھی۔ پاملیا نے کافی بنائی اور پیالیاں میز پر رکھ کر میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ میرے لئے بہت کڑی آزمائش کا وقت تھا۔ وہ میرے قریب تھی اور تنہائی بھی میسر تھی۔ اس کی محبت میرے وجود میں موج در موج امنڈ رہی تھی۔ مگر مجھے اس محبت کو آلودگی سے بچانا تھا۔ ایک گھنٹے تک ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ وہ اس پر حیران تھی کہ میں اسے اتنا زیادہ کیسے سمجھتا ہوں۔ شاید اسی احساس نے اس کے اندر سرکش جذبوں کو مہمیز کر دیا ورنہ وہ امریکی ہونے کے باوجود اتنی کمزور عورت نہیں تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرتے نظر آئے۔ اگلے ہی لمحے وہ مجھ پر گر سی گئی۔ میں بوکھلا گیا۔ میں نے اسے دور ہٹانے کی کوشش کی "یہ .... یہ کیا کر رہی ہو پاملیا؟"

"اتنے انجان نہ بنو۔ تم مجھے یہاں اپنے اپارٹمنٹ کیا صرف باتیں کرنے کے لئے لائے تھے؟" اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

"میں .... میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟"

اس کے اور میرے چہرے کے درمیان بس ایک انگلی کا فاصلہ تھا۔ میں اس کی جھیل

آنکھوں میں ڈوبا جا رہا تھا کہ اچانک اس کی آنکھوں اور چہرے کا تاثر بدل گیا۔ اس نے پلکیں جھپکائیں اور پھر غور سے مجھے دیکھا۔ "ارے .... آفاق .... آفاق تم؟" وہ بڑبڑائی۔

وہ میرے لئے بہت بڑا جھٹکا تھا۔ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا، اس کی مجھے توقع ہی نہیں تھی۔ اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں سب کچھ تھا۔ مختلف ادوار کی یادیں، شناسائی، خوف اور الجھنیں اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے پھر مجھے دیکھا۔ "میں تو سمجھی تھی، اب یہ چکر ختم ہو جائے گا۔"

"عائشہ.........."

"یہ کون سا سال ہے آفاق۔ ہمارے پاس کتنی مہلت ہے؟"

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ "صرف ۳۳ منٹ!" میں نے جواب دیا۔

"یہ .... یہ تو زیادتی ہے۔" وہ رونے لگی۔ پھر اچانک وہ چونکی۔ "اور میں کہاں ہوں .... اور کیوں ہوں اور تم میرے اتنے قریب کیوں ہو۔ کہیں تم نے.........."

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسی ویسی کوئی بات نہ سوچنا۔ تم مجھے جانتی ہو۔" میں نے اسے تفصیل سے بتایا۔ "اور اب ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ تم عائشہ بن ہی گئی ہو تو اس مہلت سے بھرپور اور بہترین استفادہ کرو۔"

"کیا مطلب؟"

"اس ری پلے کی پہلی اور آخری نماز نہیں پڑھو گی۔"

اس نے بڑی محبت سے مجھے دیکھا .... محبت اور شکر گزاری سے ....

"اللہ تمہیں اس کی جزا دے۔"

☆==========☆==========☆

میں مقررہ وقت پر جہانِ فانی سے کوچ کر گیا لیکن آنکھیں کھلیں تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کیونکہ میں اپنے دفتر میں تھا۔ میز پر وہی شیشے کا پیپر ویٹ تھا، جو اولین زندگی کے آخری لمحوں میں نیچے گر کر ٹوٹا تھا۔ میری نظریں بے اختیار میز پر رکھے ہوئے چھوٹے ڈیجیٹل کلاک کی طرف اٹھیں۔

۱۸ اکتوبر ۹۳ء ۱۲ بج کر ۵۷ منٹ دوپہر۔

یعنی مجھے مزید نو منٹ زندہ رہنا تھا۔ اتنے وقت میں، میں کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تھا .... سوائے انتظار کے۔ ایک بات البتہ اطمینان بخش تھی .... اور وہ یہ کہ یہ یقینی طور پر میرا آخری ری پلے تھا۔

میرے ہاتھ لرزنے لگے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ملال یہ تھا کہ میرے پاس نماز پڑھنے کی مہلت بھی نہیں تھی۔ بمشکل وضو ہی کر سکتا تھا، اس محرومی نے مجھے افسردہ کر دیا۔

میں اٹھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ نائب مدیر اصغر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "بڑی گرم خبریں ہیں عباسی صاحب!" میں نے دیکھا۔ وہ کمرے میں آ گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑی طرح چونکا۔ "ارے .... آپ کا تو چہرہ سپید پڑ گیا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟"

میں نے ڈیجیٹل کلاک کو دیکھا۔ ۱۸ اکتوبر ۹۳ء ایک بج کر دو منٹ دوپہر۔

"میں .... میں ٹھیک ہوں۔"

"لگتا تو نہیں۔ ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

"میرا پیچھا چھوڑ دو بس۔" میں چلایا۔

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر کمرے سے چلا گیا۔

میرے ہاتھوں کی لرزش اور بڑھتے بڑھتے اب کندھوں تک پہنچ گئی تھی۔ پھر میری پیٹھ میں درد ہونے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دانتوں سے ہونٹ کاٹنے لگا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے بلقیس کی آواز ابھری "آفاق.........؟"

"بول رہا ہوں۔" میں نے بمشکل کہا۔ میری آواز بھی لرز رہی تھی۔

"آفاق، تمہیں احساس بھی نہیں کہ........." اس نے عادت کے مطابق جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

میں نے ڈیجیٹل کلاک کی طرف دیکھا۔ ۱۸ اکتوبر ۹۳ء۔ ایک بج کر پانچ منٹ۔

اس لمحے مجھے اپنے سینے کے اندر بائیں جانب کوئی سخت اور بھاری چیز پوری قوت سے ٹکراتی محسوس ہوئی۔ میری سانس اُکھڑ گئی۔ ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹا اور میز پر

رکھے شیشے کے پیپر ویٹ سے ٹکرایا۔ پیپر ویٹ گرا اور ٹوٹ گیا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ میرا وقت آ گیا ہے۔ زبان سے کلمہ پڑھنے کی کوشش ناکام ہوئی تو میں دل میں ہی پڑھنے لگا۔

درد کی لہر جانے کتنی دیر میرے دل کو کاٹتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے درد معدوم ہو گیا۔ میرے لئے وہ سب ناقابلِ یقین تھا۔ میں نے ڈیجیٹل کلاک کو دیکھا۔ ۱۸ اکتوبر ۹۳ء۔ ایک بج کر نو منٹ اور میں زندہ تھا۔ ریسیور میز سے جھول رہا تھا۔ مجھے نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ ہاتھ اب تک کانپ رہے تھے۔ تاہم میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ رابطہ منقطع نہیں ہوا تھا۔ سائیں سائیں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "ہیلو!" میں نے ماؤتھ پیس میں پکارا، کوئی جواب نہ ملا۔ میں پکارتا رہا۔ مگر بے سود۔ پھر میں ہیلو ہیلو چیخنے لگا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

دفتر کے کچھ ساتھی کمرے میں آ گئے۔ میں نے انہیں صورت حال بتائی۔ ٹیلی فون ایکسچینج سے رابطہ کیا گیا لیکن بات نہیں بنی۔ میرے گھر کے فون کا رابطہ دفتر کے فون سے ملا ہوا تھا۔ ساتھیوں کے مشورے پر میں نے پولیس کو مطلع کیا اور خود بھی دو ساتھیوں کے ساتھ اپنے فلیٹ پہنچا۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ پولیس نے دروازہ توڑا۔ بلقیس کی لاش فون کے پاس پڑی تھی۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ میڈیکل رپورٹ نے عام اندازے کی تصدیق کر دی۔ اس کی موت کا سبب دماغ کی نس پھٹنا تھا۔

☆==========☆==========☆

دن گومگو میں گزر رہے تھے۔ عائشہ کا خیال میرے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ اگر میری طرح وہ زندہ ہوئی بھی تو شاید پامیلا رابسن ہی ہو گی۔ پھر بھی اس کی آواز تو کم از کم سن سکوں گا میں۔ ایک دن میرا ضبط جواب دے ہی گیا۔ فون نمبر مجھے یاد تھا۔ میں نے نمبر ملایا۔ چند گھنٹیوں کے بعد دوسری طرف سے ایک لڑکی آواز ابھری

"ہیلو........."

وہ عائشہ کی آواز نہیں تھی۔ "میں تمہاری ممی سے بات کر سکتا ہوں؟"

"ایک منٹ، ہولڈ کریں۔ ممی آپ کا فون ہے۔"

پھر فون پر وہ آواز سنائی دی، جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ حالانکہ وہ دور سے

آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ "ہیلو؟"

میں گنگ ہو کر رہ گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں؟

"ہیلو.......... کون ہے؟"

"آپ.......... آپ پامیلا رابسن ہیں؟" بالآخر میری خاموشی ٹوٹی۔

"جی نہیں۔ میں عائشہ ہوں۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔ پھر پس منظر میں لڑکی کا احتجاج۔

مجھ پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ "عائشہ.......... میں آفاق بول رہا ہوں۔"

عائشہ نے اپنی بیٹی سے کمرے سے چلے جانے کو کہا۔ شاید تھوڑی سی بحث کے بعد وہ چلی گئی۔ پھر عائشہ نے کہا۔ "میں خود کئی دن سے تمہیں فون کرنے کا سوچ رہی تھی۔"

"تم پر کیا گزری.......... اور اسٹیو کہاں ہے؟"

"اسٹیو کا تو ۱۸ اکتوبر ۹۳ء کو ہی انتقال ہو گیا تھا۔ میں تمہیں مُردہ چھوڑ کر آئی تو یہ اطلاع ملی۔ تب سے میں تمہارے لئے پریشان تھی۔"

"اب کیا پروگرام ہے؟"

"بچوں کی بے راہ روی سے عاجز ہوں۔ انہیں کسی طرح کنٹرول نہیں کر سکتی۔ اب تمہارے فون نے مسئلہ حل کر دیا ہے۔ میں پاکستان آ رہی ہوں۔"

"موسٹ ویلکم۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں اول و آخر ایک غریب صحافی ہوں۔"

"نماز پڑھتے ہو نا؟"

"الحمدللہ۔"

"بس اتنا کافی ہے۔ آنے سے پہلے میں تمہیں فون کروں گی۔ خدا حافظ۔"

☆==========☆==========☆

عائشہ فروری ۹۴ء میں پاکستان آ گئی تھی۔ اب ہم بے حد خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ شناساؤں کا حلقہ ہمیں خوبصورت ترین جوڑا قرار دیتا ہے۔ شاید اس لئے کہ ہم صرف پنج وقتہ نمازی ہی نہیں بلکہ اللہ کے احکامات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ حالانکہ اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں۔ یہ صرف اللہ کا کرم ہے۔ اس نے ہم پر وہ

عنایت کی کہ جس کے ہم مستحق نہیں تھے۔ سو ہم اس کا شکر ادا کرنے کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔

مجھے اولاد کی بہت آرزو تھی۔ اللہ نے اس کا سامان بھی کر دیا۔ عائشہ امید سے ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں اور عائشہ اولاد کی تربیت ایسی کریں گے کہ وہ قابلِ فخر مسلمان اور پاکستانی ثابت ہو اور اللہ سے دعا بھی یہی ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ سب کو ہدایت دے اور ہم سب بہت اچھے مسلمان اور پاکستانی بنیں۔ آمین!

===== ختم شد =====